ستمبر ۲۰۱۷ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

دسمبر

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۱، شمارہ ۹، ستمبر ۲۰۱۷ء / ذی الحجہ ۱۴۳۸ھ

مشمولات

○ فکر و نظر

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ

میاں نواز شریف کی ہزیمت و رسوائی کا اصل سبب — مدیر — ۶

○ تعلیم و تحقیق

- اسلامی تحقیق کے اُصول — ڈاکٹر محمد رفیع الدین — ۸
- مطالعۂ مغربی فکر و تہذیب - کتابیات و مآخذ (آخری قسط) — سید خالد جامعی — ۲۰

○ اسلام اور مغرب

اسلام، سیکولرازم اور اقبال — پروفیسر محمد انور صادق — ۲۹

○ فہم دین

کرپشن کی شرعی حیثیت — ڈاکٹر محمد امین — ۴۳

○ پاکستانیات

- یہ اخلاقی پستی کی انتہاء ہے — مدیر — ۴۵
- میرا دُکھ کچھ اور ہے — 'نقیب سحر' — ۵۰

○ میڈیا

الیکٹرانک میڈیا کی لت — عبدالمتین — ۵۴

○ مغربی فکر و تہذیب

اہل مغرب کے اخلاق و عدل کا افسانہ — فرید اللہ الصافی — ۵۶

خدمت اسلام و قرآن کا ایک عظیم منصوبہ

سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ترجمہ قرآن* سکھانے کی مہم بذریعہ

تدریس القرآن ①

کتابیں بلا معاوضہ مہیا کی جائیں گی

* ہر سکول، کالج، یونیورسٹی کو جو اپنے طلبہ وطالبات کو ترجمۂ قرآن سکھانا چاہے تدریس القرآن (دو کتابیں ایک برائے معلم اور دوسری برائے طلبہ) بلا معاوضہ مہیا کی جائیں گی، اور ترجمۂ قرآن سکھانے والے اساتذہ کی تربیت بھی بلا معاوضہ کی جائے گی۔

* ترجمۂ قرآن سکھانے کا انداز بہت سادہ ہے۔ تدریس القرآن ① پہلے پارے کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ تیسویں پارے کا آخری چوتھائی برائے حفظ ہے۔ ترجمے کو اہم دینی مکاتب فکر کے معتبر علماء کرام کی تائید حاصل ہے۔

* جو سکول، کالج اور یونیورسٹیاں اپنے طلبہ کو تدریس القرآن کے ذریعے ترجمۂ قرآن سکھانا چاہیں یا جو افراد اور ادارے اس منصوبے کی ترویج کے لیے کام کرنا چاہیں وہ رابطہ فرمائیں:

ڈاکٹر محمد امین
0300-4354673

پروفیسر ملک محمد حسین
0333-4404260

* تحفیظ، تجوید اور مطالعۂ احادیث بھی اس پروگرام کا حصہ ہے۔

مالیات

ترجمۂ قرآن سکھانے کا یہ منصوبہ چونکہ فی سبیل اللہ ہے لہٰذا جو اصحاب اپنی آخرت کی خاطر سارے ملک کے تعلیمی اداروں میں ترجمۂ قرآن سکھانے کے اس منصوبے کی مالی ضروریات پوری کرنے میں ہاتھ بٹانا چاہیں وہ رابطہ فرمائیں:

محمد یحییٰ رشید ایڈووکیٹ (سیکرٹری جنرل تدریس القرآن فاؤنڈیشن)

فون:0333-428 7640　　ای میل:yahya_yrc@yahoo.com

3rd فلور، آفس نمبر 8، شان پلازہ، کریم بلاک مارکیٹ۔ علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

تدریس القرآن فاؤنڈیشن

کیمپ آفس: 3rd فلور، آفس نمبر 8، شان پلازہ، کریم بلاک مارکیٹ، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

ترجمۂ قرآن سکھانے کا طریقہ

طلبہ کی کتاب معری ہے یعنی بغیر ترجمے کے۔ معلمین کی کتاب ان اساتذہ کو جو عربی زبان اور اسلامی علوم کے ماہر نہ ہوں، اس قابل بناتی ہے کہ وہ طلبہ کو ترجمۂ قرآن سکھا سکیں۔ اس میں لفظی ترجمۂ ہے جو بہت زیادہ لفظی ہے۔ پھر اس کے نیچے بامحاورہ اور تفسیری ترجمہ ہے تاکہ بات سمجھ میں آجائے۔ موضوع کا لحاظ رکھتے ہوئے پہلا پارہ ۲۵ اسباق پر مشتمل ہے۔ ہر سبق کے آخر میں ترجمہ سے متعلق ضروری نکات بیان کیے گئے ہیں۔ پھر ان آیات کے مفہوم کی تلخیص دی گئی ہے۔ آخر میں وہ چند نکات بیان کیے گئے ہیں جو ہم سے عمل کا تقاضا کرتے ہیں۔

ہر اہم قرآنی لفظ کا مادہ نکال کر دکھایا گیا ہے اور اس کا اردو استعمال بتایا گیا ہے۔ پھر جو حروف اور ضمیریں بار بار آتی ہیں ان کو اور ان کے لفظی ترجمے کو سرخ رنگ میں طبع کیا گیا ہے تاکہ وہ نمایاں ہو کر نظر میں آئیں اور بار بار اعادے سے ذہن نشین ہو جائیں۔ قرآنی لفظ کے مادہ کو بھی سرخ رنگ دیا گیا ہے۔ عربی گرامر براہ راست نہیں سکھائی گئی۔ تجربہ یہ ہے کہ اس طرح ایک پارے کا ترجمہ سیکھ لینے سے طالب علم بقایا قرآن حکیم کے تقریباً ۸۵ فیصد الفاظ کا ترجمہ سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے اور باقی پاروں کا ترجمہ بہت تیزی اور آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب معلمین کا مقدمہ۔

فکرونظر

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ

میاں نواز شریف کی ہزیمت ورسوائی کا اصل سبب

دنیا میں جتنے واقعات رونما ہوتے ہیں ان کے کچھ اسباب فوری اور ظاہری ہوتے ہیں جو ہر کسی کو نمایاں نظر آتے ہیں اور کچھ اسباب زیادہ گہرے، باطنی، اخلاقی یا روحانی نوعیت کے ہوتے ہیں جو ذرا غور کرنے پر سمجھ میں آتے ہیں۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ میاں نواز شریف سے زیادہ کرپٹ، قانون شکن اور بدکردار لوگ ہمارے معاشرے میں موجود ہیں اور حکمرنوں میں بھی رہے ہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ دوسرے کرپٹ لوگوں کی تو پکڑ نہیں ہوئی لیکن میاں نواز شریف مع خاندان پکڑے گئے اور ہزیمت ورسوائی ان کا مقدر ٹھہری۔

ممکن ہے کہ دوسرے لوگ اس کی کئی دوسری توجیہات پیش کریں اور ان میں وزن بھی ہو لیکن ہمیں اس پر کامل شرح صدر حاصل ہے کہ اس کی ایک ہی بڑی اور بنیادی وجہ ہے اور وہ شہیدِ آبروئے رسالت ممتاز قادری کی پھانسی ہے۔ میاں نواز شریف اور ان کی حکومت جب یہ ظلم ڈھا رہی تھی تو البرہان کے اداریے گواہ ہیں کہ ہم نے بڑے درد سے کہا تھا کہ میاں صاحب! یہ ظلم نہ کرو۔ یہ دنیا وآخرت کی رسوائی ہے، اسے مول نہ لو۔ اقتدار آنی جانی چیز ہے، اس کے لیے اور مغرب کی خوشنودی کے لیے اتنے بڑے اور بُرے فیصلے نہ کرو جو ہماری چودہ سو سالہ تاریخ میں کسی مسلمان حکمران نے نہیں کیے.... لیکن ہماری نحیف آواز آپ نے نہ سنی۔

آج آپ اربوں کھربوں کے مالک ہونے کے باوجود، اقتدر میں ہونے کے باوجود اسمبلیوں میں اکثریت ہونے کے باوجود، قومی اور بین الاقوامی سطح پر بارسوخ اور وسیع ترین تعلقات رکھنے کے باوجود ذلیل وخوار ہو رہے ہیں اور ابھی تو ابتداء ہے، آگے مزید سخت مراحل آنے والے ہیں.... اور اس سے بھی آگے اصل میدان تو حشر میں لگے گا.... وہاں بھی میاں صاحب! ممتاز قادری کا خون آپ کا پیچھا کرے گا اور آپ کو کہیں پناہ نہ ملے گی۔ ہم اِسی وقت

سے آپ کو ڈراتے تھے اور اب بھی ڈراتے ہیں۔ یہ پی ٹی آئی، جے آئی ٹی اور سپریم کورٹ کی پکڑ نہیں یہ اللہ کی پکڑ ہے۔ میاں صاحب! اس پکڑ سے بچنے کی فکر کیجیے۔ اللہ سے توبہ کیجیے، معافی مانگیے، پھر ممتاز قادری کی قبر پر جاکر اس سے معافی مانگیے، اس کے باپ کے آگے سر جھکائیے۔ اس کے بھائیوں کو پُرسا دیجیے۔ اس کی بیوہ کے سر پر ہاتھ رکھیے اور اس کے یتیم بچوں پر شفقت کیجیے....تو شاید اللہ کو آپ پر رحم آجائے اور اس کی پکڑ میں کچھ کمی ہو۔

یہ سطور آپ سے ہمدردی میں قلم بند ہوگئیں کہ آخر کو آپ ہمارے نبی کا کلمہ پڑھتے ہو اور ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو توبہ کی توفیق عطا فرمائیں اور دنیا و آخرت کی رسوائی سے بچائیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ ممتاز قادری کی پھانسی ایک عام پھانسی نہ تھی، یہ سمبل تھی اس ملک میں اسلامی طرزِ فکر اور اسلامی طرزِ حیات کے خاتمے کا بلکہ پورے اسلام کی رخصتی کا، کیونکہ آج اگر ہم مسلمان ہیں، اگر ہم ایک امت اور معاشرہ ہیں تو اس کی بنیادی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہماری محبت ہے۔ آپ نے میاں صاحب! اس محبت رسول پر ضرب لگائی تو سمجھیے پورے دین پر ضرب لگائی۔

ہم نے اپنی نحیف آواز اُس وقت بھی آپ تک پہنچانے کی سعی کی تھی جب آپ یہ ظلم ڈھا رہے تھے۔ اب بھی کوشش کریں گے کہ یہ بات کسی طرح آپ تک پہنچ جائے اور آپ کو توبہ کی توفیق مل جائے۔ لیکن ہوتا بالآخر وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے اور توبہ کی توفیق بھی اسی کو ملتی ہے جسے وہ بخشنا چاہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور سب مسلمانوں کو توبہ کی توفیق عطا فرمائیں اور دنیا و آخرت کی رسوائی سے بچائیں۔ اپنے فضل و کرم سے نوازیں اور دنیا و آخرت میں کامیابی سے ہم کنار فرمائیں (آمین یاربّ العالمین)۔

تعلیم و تحقیق

ڈاکٹر محمد رفیع الدین(۱)

اسلامی تحقیق کے اصول

اسلامی تحقیق کے معنی

اس وقت ملک میں اسلامی تحقیق کے کئی ادارے کام کر رہے ہیں۔ جن میں بعض حکومت کی سرپرستی میں ہیں اور بعض پرائیویٹ، لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں اسلامی تحقیق کا مفہوم واضح نہیں۔ اسلام جیسا کہ اسے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے پاس لائے ہیں، ان مقدس تعلیمات کا نام ہے جو قرآن اور حدیث میں موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اسلامی تحقیق کی تعریف اس طرح سے کرنی چاہئے کہ اسلامی تحقیق وہ تحقیق ہے، جس کا موضوع ہماری ان مقدس کتابوں کے مشتملات ہوں اور جس کا مقصد یہ ہو کہ ان مشتملات کو لوگوں کے لیے زیادہ قابل فہم بنایا جائے۔

اس تعریف کی روشنی میں ہم بآسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلامی تحقیق میں کونسی چیزیں شامل ہیں اور کونسی شامل نہیں۔ مثلاً اس میں وہ سب تحریریں شامل ہوں گی جو مسلمان علماء (ا) ان مقدس کتابوں کے متعلق یا (ب) ان کتابوں کے متعلق جو ان مقدس کتابوں کے متعلق لکھی گئی ہوں، ماضی میں لکھ چکے ہیں یا آئندہ لکھیں گے۔ پھر چونکہ یہودی یا عیسائی مستشرقین نعمت ایمان سے بے نصیب ہونے کی وجہ سے ہماری مقدس کتابوں کو مقدس کتابوں کی حیثیت سے نہیں سمجھ سکتے اور ان سے توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ ان کو مقدس کتابوں کے مقدس مشتملات کی حیثیت سے دوسروں کے اذہان کے قریب لانے کی کوشش کر سکتے ہیں یا ایسا کرنے کی نیت ہی رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اسلامی تحقیق سے وہ وہ تمام تحریریں خارج سمجھی جائیں گی جو یہودی اور عیسائی مستشرقین ہماری کتابوں کے متعلق یا ان کتابوں کے متعلق جو ہماری مقدس کتابوں کے متعلق لکھی گئی ہوں، ماضی میں لکھ گئے ہیں یا آئندہ لکھیں گے۔

میکانکی اور اصلی اسلامی تحقیقات

اسلامی تحقیق کی دو قسمیں ہیں یا تو یہ میکانکی ہوتی ہے یا اصلی، مثلاً مقدس کتابوں یا مقدس

(۱) نامور فلسفی، مصنف، مسلم دانشور اور بانی صدر آل پاکستان ایجوکیشنل کانگرس، لاہور

کتابوں پر لکھی ہوئی کتابوں میں سے کسی کتاب کی کوئی لغات یا کوئی اشاریہ تیار کرنا یا اس کے مشتملات کا ترجمہ کرنا یا ان کوئی ترتیب دینا یا ان کا اختصار لکھنا یا کسی ایسے تاریخی قسم کے یا کسی اور نوعیت کے مواد کا جو ان کے مضمون سے تعلق رکھتا ہو اس غرض سے جمع کرنا کہ اس کے حوالے آسانی سے میسر آ جائیں۔ میکانکی اسلامی تحقیق ہے جبکہ مقدس کتابوں کے مضمون کی علمی تشریح یا تفسیر یا توسیع کرنا اصلی اسلامی تحقیق ہے۔ اصلی اسلامی تحقیق میکانکی اسلامی تحقیق سے بدر جہا زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق اسلام اور اس کی روح سے ہوتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو درحقیقت اسلامی تحقیق سے ایسی ہی تحقیق مراد ہے۔ اس قسم کی اسلامی تحقیق کے لیے تعلیمات اسلام کی گہری بصیرت کی ضرورت ہے اور اسلام کی ایسی بصیرت صرف اس عالم دین کا حصہ ہو سکتی ہے جو اسلام پر ایسا خالص اور پختہ ایمان رکھتا ہو کہ وہ خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شدید محبت کی صورت اختیار کرے اور جو اسلام کے مذہبی اور اخلاقی ضبط اور نظم کو دل و جان سے قبول کر چکا ہو اور اس پر متواتر عمل پیرا ہو۔ پھر یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک کہ کوئی عالم دین مقدس کتابوں کے بار بار کے مطالعہ سے ان کی روح میں نہ گھس جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلی اطاعت سے انسان اور کائنات کا وہی نظریہ پیدا نہ کر لے جو خدا نے آپ کی معرفت ہم تک پہنچایا ہے۔ چونکہ اس قسم کی اسلامی تحقیق صرف خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اسلام کی شدید محبت کے سرچشمہ سے ہی پھوٹ سکتی ہے لہٰذا وہ دوسروں میں بھی اسلام کی محبت پیدا کرتی ہے۔ اس قسم کی اسلامی تحقیق کی مثال شاہ ولی اللہ، غزالیؒ، رومیؒ، محی الدین ابن العربیؒ، ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور اقبالؒ ایسے حکمائے دین کی کتابیں ہیں۔

اصلی اسلامی تحقیق کے وظائف

چونکہ اصلی اسلامی تحقیق ہمیشہ اسلام کی عقلی اور علمی بنیادوں کے خلاف زمانہ کے عقلی اور علمی چیلنج کا جواب ہوتی ہے لہٰذا وہ دو اہم وظائف ادا کرتی ہے۔ **ایک** یہ کہ وہ ان فلسفیانہ افکار کا بالواسطہ یا بلاواسطہ ابطال کرتی ہے جو اس خاص زمانہ میں رواج پا کر مسلمان کے یقین و ایمان پر ایک مخالفانہ اثر پیدا کر رہے ہوں اور **دوسرا** یہ کہ وہ اسلام کی صداقت کو ثابت کرتی ہے اور تمام صحیح تصورات کو جو اس زمانہ میں دستیاب ہو سکتے ہوں کام میں لاکر اسلامی افکار و اعتقادات کی مدافعت کرتی ہے۔ یہ دو وظائف ادا کرنا اس کے لیے اس طرح سے ممکن ہوتا ہے کہ اسلام کا محقق اسلام کی شدید محبت اور اس کی صحیح تشریح اور تعبیر کرنے کی شدید خواہش کی وجہ سے ایک ایسا صحیح

وجدان حاصل کر لیتا ہے اور اشیاء اور حقائق کے بارہ میں ایک ایسا صحیح نقطہ نظر پیدا کر لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ صحیح افکار کو غلط افکار سے بآسانی ممیز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

میکانکی اسلامی تحقیق کے وظائف

میکانکی اسلامی تحقیق کیلئے اسلام کی کسی بصیرت کی ضرورت نہیں ہوتی اور چونکہ یہ ضروری نہیں کہ وہ اسلام کی محت کا نتیجہ ہو لہٰذا وہ اسلام کی محبت کو منعکس کرتی ہے اور نہ اسے دوسروں میں پیدا کر سکتی ہے۔ میکانکی اسلامی تحقیق کی اہمیت فقط یہ ہے کہ وہ اسلام کے عام طالب علم کے لیے اسلام کی مقدس کتابوں کا مطالعہ آسان کرتی ہے اور ان مقدس کتابوں کے مضمون کو اصلی اسلامی تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے عالم دین کی آسانی دسترس میں لا کر اس کی تحقیقی ضرورتوں کی خدمت اور اعانت کرتی ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اصلی اسلامی تحقیق سے شغف رکھنے والا عالم دین ایک ایسا ماہر تعمیرات ہے جو ایک خوبصورت عمارت کا نقشہ تیار کر کے اسے تعمیر کی ساری منزلوں سے گزارتا ہے اور میکانکی اسلامی تحقیق پر کام کرنے والا پڑھا لکھا آدمی وہ جفاکش مزدور ہے جو تعمیر میں کام آنے والی اینٹوں کو ڈھو کر اس ماہرِ تعمیرات کے قریب لے آتا ہے۔

مستشرقی تحقیق

ہوسکتا ہے کہ بعض وقت اسلام کی مقدس کتابوں پر خالص میکانکی تحقیق کا باعث یہ ہو کہ تحقیق کرنے والے کو اسلام سے محبت ہے لیکن اس کے کامیاب تتبع کے لیے اسلام کی صداقت پر ایمان و یقین کی موجودگی ایک شرط کے طور پر قطعاً ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں یہودی اور عیسائی مستشرقین بھی اسے بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس دور میں اس کے اصلی موجد مغرب کے یہودی اور عیسائی مستشرقین ہی ہیں لیکن ایسی حالت میں اسے اسلامی تحقیق کا نام دینا ہرگز درست نہیں۔ کیوں کہ اس حالت میں یہ ایک وسیع تر تحقیق کا حصہ ہے جسے مستشرقی تحقیق کہا جاتا ہے اور جسے مغرب میں علماء کے ایسے گروہ نے ایجاد کیا تھا جو اپنے آپ کو ''مستشرقین'' کا نام دیتا تھا کیونکہ وہ مشرقی ادب اور السنہ سے دلچسپی رکھتا تھا اور انہیں جاننا چاہتا تھا۔ مستشرقی تحقیق سراسر ایک میکانکی عمل ہوتا ہے اور اس کا دائرہ کار یہ ہوتا ہے کہ ماضی میں عربی، فارسی، سنسکرت، چینی انڈونیشی اور ترکی ایسی مشرقی زبانوں میں تاریخ، مذہب، فلسفہ، لغت، سائنس اور ادب وغیرہ کے موضوعات پر جو کتابیں لکھی گئی تھیں ان کا ترجمہ یا حاشیہ یا اختصار یا

اشاریہ تیار کیا جائے یا ان کی تشریح یا توسیع یا تنقید بہم پہنچائی جائے۔

شروع میں اس تحقیق کے اغراض و مقاصد کلیتہً مشنری یا تبلیغی تھے۔ اس کے بعد جب یورپی طاقتیں مشرق میں اپنی نو آبادیاں بنانے لگیں تو اس کے اغراض و مقاصد تبلیغی ہونے کے علاوہ انتظامی اور سیاسی بھی ہو گئے۔ مستشرقی مطالعات سے اہل مغرب کا ایک مقصد بلا ریب یہ ہے کہ وہ اپنے ذوق دریافت کو مطمئن کریں اور ایک ایسی تہذیب کے مخفی آثار کو بے نقاب کر کے اپنی تفریح کا سامان بہم پہنچائیں جو ان کے خیال میں ہمیشہ کے لیے مٹ چکی ہے اور اپنی جگہ پر اس تہذیب کو چھوڑ گئی ہے جو اس کے کئی درجہ بلند تر اور برتر ہے اور جس کے وہ خود علمبردار ہیں۔ ان کا مقصد ویسا ہی ہے جیسا کہ ٹیکسلا کی کھدائی سے ہمارا ہے کہ ہم اس کے ذریعہ سے ماضی کے متعلق لوگوں کی معلومات کی خواہشات کی تشفی کے لیے یا ان کی تفریح کا ایک شغل پیدا کرنے کیلئے ایک ایسی پرانی تہذیب کے دفن کئے ہوئے نشانات کو بے حجاب کرتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے مٹ چکی ہے۔ اب جبکہ مغرب کی تمام یونیورسٹیاں اپنے ہاں مستشرقی مطالعات کی کرسیاں قائم کر کے مستشرقی تحقیق کی سرپرستی کر رہی ہیں مستشرقی تحقیق مغرب اور مشرق دونوں میں ایک باعزت اور زر آفریں پیشہ بن گئی ہیں۔ وقت کے گزرنے سے مستشرقین نے مستشرقی تحقیق کا ایک خاص فن ایجاد کر لیا ہے جو ہمارے السنہ شرقیہ کے طالب مغرب کی یونیورسٹیوں میں ان سے سیکھتے ہیں۔ اب مشرق کی بہت سی یونیورسٹیوں میں بھی مشرقی علوم کی کرسیاں قائم ہو چکی ہیں اور یہ کرسیاں بالعموم ان لوگوں نے سنبھال رکھی ہیں۔ جن کو مغربی مستشرقین نے مستشرقی تحقیق کے فن کی تربیت دی ہے۔ لیکن جہاں تک اسلامی تحقیق کا تعلق ہے یہ فن اس کے میکانکی حصہ کیلئے کسی قدر سودمند ہو تو ہو ورنہ محض بیکار ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب

عربی اور فارسی کی کتابوں پر جو بالعموم مسلمانوں نے لکھی ہیں، مستشرقین کی تحقیق کا سبب نہ اسلام کی محبت ہے اور نہ مسلمان علماء اور فضلا کی قدردانی بلکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان مستشرقین کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بالعموم ایک شدید قسم کا تعصب موجود ہوتا ہے لہٰذا جب بھی وہ اپنے میکانکی کام سے ذرا ہٹ کر مسلمانوں کے معتقدات اور نظریات کی توجیہہ کرنے لگتے ہیں تو ان سے یہ توقع کرنا ہی عبث ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے متعلق کوئی موافقانہ رائے قائم کریں گے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تحقیق کا ایک حصہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اعتراضات سے معمور ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان کے کام کے اس

حصہ کو نظر ثانی کے بعد ان کی غیر منصفانہ تنقید سے پاک کریں۔ لیکن جس حد تک مستشرقین کے کام کی اس قسم کی نظر ثانی مسلمانوں کی ایسی تصنیفات کے متعلق ہو گی جو اسلام کے علاوہ اور موضوعات پر ہیں ہم اسے میکانکی قسم کی اسلامی تحقیق بھی نہیں کہہ سکیں گے۔ بلکہ ہم اسے فقط ایسی مستشرقی تحقیق کا نام دے سکیں گے جو مسلمانوں کے ہاتھوں سے انجام پائی ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایسی کتابوں پر جو اسلام کے علاوہ اور موضوعات پر ہوں۔ مسلمانوں کی ساری تحقیق کو ہم مستشرقی تحقیق ہی کا نام دے سکتے ہیں۔

ایک غلط نام

بد قسمتی سے اس دوسری قسم کی تحقیق کو بھی غلط طور پر اسلامی تحقیق کا نام دیا جاتا ہے اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی عربی اور فارسی کتابوں پر تحقیق ہے۔ لیکن درحقیقت عہد قدیم کے مسلمانوں نے اسلام کے علاوہ اور موضوعات پر جو کتابیں لکھی ہیں ان کو اسلامی کتابیں کہنے کا جواز اتنا ہی ہے جتنا اس بات کا جواز کہ ہم ایک مسلمان کے ہاتھ کے بنے ہوئے میز کو اسلامی میز کہہ دیں یہ کتابیں اسلامی کتابیں ہیں اور ان پر تحقیق اسلام کی تحقیق ہے تو پھر اس زمانہ کے مسلمانوں نے اسلام کے علاوہ اور موضوعات پر جو کتابیں لکھیں ہیں، کیا وجہ ہے کہ ہم ان کو اسلامی کتابیں نہ کہیں اور ان پر تحقیق کو بھی اسلامی تحقیق کا نام نہ دیں؟ لیکن نہ ہم ان کتابوں کو اسلامی کتابیں کہتے ہیں اور نہ ان پر تحقیق کو اسلامی تحقیق کا نام دیتے ہیں تو پھر ہم کو اس بات پر اصرار کیوں ہے کہ گزشتہ مسلمانوں کی لکھی ہوئی اس قسم کی کتابوں کو اسلامی کہہ کر پکاریں۔

آسمانی یا الہامی علم کے برخلاف ذہنی علم غلط بھی ہوسکتا ہے اور صحیح بھی۔ غیر واضح بھی ہوسکتا ہے اور واضح بھی۔ منظم بھی ہوسکتا ہے اور غیر منظم بھی، لیکن ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ یہودی یا عیسائی یا اسلامی ہو۔ علم ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ وہ ایک ہی منبع سے صادر ہونے ولا ایک ہی نور ہے جو کبھی ایک فرد پر اور کبھی دوسرے فرد پر، کبھی ایک قوم پر اور کبھی دوسری قوم پر اپنی خوشی سے چمکتا ہے۔ ذہنی علم مذہبوں اور قوموں سے بالا ہے یہی وجہ ہے جو لوگ اس علمکی تحصیل یا تحقیق میں منہمک ہوتے ہیں۔ وہ مذہب یا قومیت سے قطع نظر کر کے ایک دوسرے سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

مستشرقی تحقیق کا ایک خاصہ

چونکہ مستشرقی تحقیق فقط ایک عمل ہوتا ہے اور اس کے پاس کوئی نئی چیز کسی کو دینے کے لیے

نہیں ہوتی۔ اس کا ایک خاصہ یہ ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہت زور دیتی ہے مثلاً ایک مستشرق اپنی پوری زندگی یہ ثابت کرنے پر صرف کردے گا کہ ایک مصنف یا اس کی کسی کتاب کا صحیح نام یہ ہے اور وہ نہیں یا فلاح شخص جس مقام پر پیدا ہوا تھا وہ فلاں گاؤں سے اتنے میل شمال کو تھا اور جنوب کو نہیں یا جس تاریخ کو پیدا ہوا تھا وہ پانچ دن پہلے تھی اور پیچھے نہیں۔ اگرچہ وہ شخص خود ایک عالم کے طور پر کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو اور بالکل اس قابل ہو کر فراموش کردیا جائے۔ لیکن وہ اس لئے اہم سمجھا جاتا ہے کہ کسی پرانی کتاب میں اس کا نام آ گیا ہے۔

مسلمان مستشرق کا اصلی کام

اگر مستشرقی تحقیق کا مقصد یہ ہوتا کہ مشرق کے گزشتہ علماء اور فضلاء کے علمی کارناموں کو اجاگر کیا جائے (اور اس میں شک نہیں کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ مشرق علوم وفنون میں کرۂ عرض کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ حصہ تھا) اور اس کا تعلق دور حاضر کی علمی ترقیوں کے ساتھ واضح کیا جائے تو پھر بھی یہ اسلامی تحقیق کا کام نہ ہوتا۔ اگرچہ یہ عمومی طور پر علم کی بہت بڑی خدمت ہوتی کیوں کہ اس سے نوع انسانی کی علمی جدوجہد کے ماضی کو اس کے حال کے ساتھ جوڑ کر اس کے تسلسل کو آشکار کرنے میں مدد ملتی ہے لیکن اس وقت مستشرقی تحقیق کا کام نہ مغرب میں ان خطوط پر ہو رہا ہے اور نہ مشرق میں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام بہت مشکل ہے کیونکہ اس کے لیے نہ صرف عہد قدیم کی علمی دنیا سے بلکہ عصر حاضر کی علمی دنیا سے بھی پوری طرح باخبر ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ وہ اصلی کام ہے جو مستشرقین کو بالخصوص مسلمان مستشرقین کو انجام دینا چاہئے۔

آخر جہاں تک ہم مسلمانوں کا تعلق ہے، ہمارا مقصد علم کی جستجو ہونا چاہئے نہ کہ مشرقی علم کی جستجو۔ علم نہ مشرقی ہوسکتا ہے، نہ مغربی۔ کم از کم ہمارے بزرگوں نے علم کی کوئی ایسی تقسیم نہ کی تھی اور نوع انسانی کے جن بیش بہا علمی کارناموں کا سہرا آج ان کے سر باندھا جارہا ہے اس کی وجہ یہی ہے۔ اگر درخشندہ علمی ستاروں کا وہ طویل وعریض جمگھٹا جو مسلمان علماء اور فضلاء پر مشتمل تھا اور اب غائب ہو چکا ہے، یکا یک پھر زندہ ہو جائے تو وہ سب بلا توقف اس بات کی کوشش کریں گے کہ مغرب کے سارے علوم کو سیکھ کر ان کے ماہر بن جائیں۔ اگر مستشرقی تحقیق سے مدد فی الواقع علم کی جستجو ہے تو یہ بات اس مدعا سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے کہ ایسی تحقیق یا ایسے مطالعہ کے لیے لفظ مستشرقی کا اور مسلمان علماء کے لیے لفظ مستشرقین کا استعمال بالکل ترک کردیا جائے۔ ان الفاظ

کا استعمال ہم نے درحقیقت اہل مغرب کی کورانہ تقلید میں شروع کیا تھا جو مستقل طور پر مغرب میں رہتے ہیں اور اپنا ایک مستقل مشرق رکھتے ہیں۔ ہم مشرق میں بھی رہتے ہیں اور مغرب میں بھی اور تمام زبانیں ہماری ہیں۔ دنیا بھر میں مشکل سے کوئی ایسی زبان ہوگی جو کم از کم چند مسلمانوں کی مادری زبان نہ ہو۔ تمام صحیح علم جو مشرق یا مغرب میں آج تک پھیلا ہوا ہے، ہمارا ہے کیونکہ ہمارے خدا کی کائنات کا علم ہے۔ یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ ہم ''مستشرقی تحقیق'' کے نام کو ''علوم قدیمہ و وسطیٰ کی تحقیق'' کے نام سے بدل دیں اور اس کے دائرہ کار کو وسعت دے کر اس میں ان کتابوں پر تحقیق کو بھی شامل کرلیں جو قدیم زمانہ میں نہ صرف عربی، فارسی، سنسکرت، چینی اور ترکی ایسی زبانوں میں لکھی گئی تھیں، جن کو مشرقی زبانیں کہا جاتا ہے بلکہ لاطینی اور یونانی ایسی قدیم یورپی زبانوں میں بھی لکھی ہوئی موجود ہیں۔

مستشرقی تحقیق اسلامی تحقیق نہیں ہے

بہرحال مستشرقی تحقیق اور اسلامی تحقیق میں کوئی قدر مشترک نہیں اور مستشرقی تحقیق کو اسلامی تحقیق سے قطعی طور پر الگ رہنا چاہیے۔ جیسا کہ مغرب میں دستور ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس کو اپنی یونیورسٹیوں کے السنہ شرقیہ کے شعبوں کے ندر محدود کردیں۔ اسلامی تحقیق کا کوئی ادارہ اپنے نام اور کام کے ساتھ ہم آہنگ رہتے ہوئے اس سے کوئی سروکار نہیں رکھ سکتا۔

میکانکی اسلامی تحقیق اور اصلی اسلامی تحقیق بعض اوقات ایک دوسرے پر منطبق ہوجاتی ہیں

بعض اوقات اصلی اسلامی تحقیق اور میکانکی اسلامی تحقیق ایک دوسرے پر منطبق ہوجاتی ہیں جس کی وجہ سے اصلی تحقیق کی کسی پیداوار کے اندر مقدس کتابوں کے مشتملات کی ترتیب نو یا ترکیب جدید کی صورت میں میکانکی تحقیق کے عناصر شامل ہوجاتے ہیں یا میکانکی تحقیق پر ان مشتملات کی تشریح یا تفسیر کا بھی ایک رنگ چڑھ جاتا ہے۔ تاہم اسلامی تحقیق کی کسی پیداوار کی قدر و قیمت کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ اس میں اصلی اسلامی تحقیق کا عنصر کس قدر موجود ہے۔ اگر اس میں درستی اور علم کے اعتبار سے بلند معیار رکھنے والی اصلی اسلامی تحقیق کا عنصر زیادہ ہوگا تو اس کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہوگی۔ یہی سبب ہے کہ اقبالؒ، ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ، غزالیؒ، رومیؒ اور محی الدین ابن عربیؒ کی اسلامی تحقیق دوسرے سینکڑوں علماء متقدین و متاخرین کی تحقیق سے بدر جہا زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر عالم دین نے اپنے زمانہ میں اسلام کی وہ جدید علمی اور

عقلی تشریف بہم پہنچائی ہے جس کی اس زمانہ میں لوگوں کو ضرورت تھی۔ اقبال نے اسلام کی جو تشریح کی ہے، اس کی شدید ضرورت کا زمانہ ابھی موجود ہے۔

وحی اور عقل

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کی ضرورت ہی کیا ہے کہ عقلی اور علمی نقطہ نظر سے اسلام کی کوئی تشریح کی جائے اور بار بار کی جائے۔ کیا یہ بات صحیح نہیں کہ قرآن اور حدیث دونوں مل کر انسانی افراد کے اعتقاد و عمل کی رہنمائی کرنے کے لیے پوری طرح کافی ہیں۔ کیا قرآن اور حدیث نے پہلے ہی ضروری حد تک اپنے مطالب کی وضاحت نہیں کر دی؟ کیا ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم خدا کی وحی کے فرامین اور خدا کے رسول کے ارشادات میں ایک پچرا اپنی طرف سے بھی لگائیں اور ان میں اپنی انسانی سمجھ بوجھ اور انسانی عقل و فراست کی بنا پر بھی کچھ باتوں کا اضافہ کریں تاکہ وہ زیادہ قابل فہم اور زیادہ مفید بن جائیں بالخصوص اس حقیقت کے پیش نظر کہ ہم کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ انسان کی ہدایت کے ایک ذریعہ کے طور پر انسانی عقل خدا کی وحی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ خدا کی وحی کے مقابلہ میں عقل انسانی کا ہرگز کوئی مقام نہیں کہ وہ انسان کو یہ بتا سکے کہ انسان اور کائنات کی حقیقت کیا ہے اور اس حقیقت کی روشنی میں انسانی فرد اور جماعت کو اپنی عملی زندگی کی تشکیل کس طرح سے کرنی چاہیے۔ اس کے باوجود خدا کی وحی اور انسانی عقل کے درمیان ایک ایسا قدرتی رشتہ ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا اور جس کی بنا پر ذیل کے حقائق بالکل درست اور ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بالا ہیں۔

اوّل: یہ کہ ہم خدا کی وحی کو اس وقت تک قبول نہیں کر سکتے جب تک کہ ہماری عقل اس وجدان یا یقین کی طرف رہنمائی نہ کرے کہ وہ درحقیقت خدا کی وحی ہے اور حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے انسان کو عقل سے کام لینے کی بار بار ہدایت کی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم ہر مدعی نبوت کو نبی نہیں مانتے اور جھوٹے اور سچے نبی میں اپنی عقل کو کام میں لا کر فرق کرتے ہیں؟

دوم: یہ کہ خدا کی وحی ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے جو آخر کار ضبط تحریر میں آجاتے ہیں اور ایک خارجی وجود رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی پڑھنے والا یا سننے والا ان الفاظ پر ایمان لائے اور ان کے مطابق عمل کرے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کے ذہن کے اندر کسی مطلب یا معنی یا مدعا

میں تبدیل ہوں۔ جب تک کہ وہ ایک خارجی حقیقت سے ایک داخلی احساس میں تبدیل کرنے والے اس عمل میں سے نہیں گزرتے اور یہ یاد رہے کہ تبدیلی کا یہ عمل سراسر ذہنی اور انسانی ہے۔ خدائی یا آسمانی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں جب تک کہ وہ ایک علمی اور عقلی توجیہہ کا لباس نہیں پہن لیتے اس وقت تک نہ تو وہ ایمان پیدا کر سکتے ہیں اور نہ عمل۔ یہی سبب ہے کہ ایک ہی وحی کا اتباع کرنے والے لوگوں کے اعتقادات اور اعمال مختلف ہیں اور اسلام جو ایک ہی ہے مذہبی فرقوں اور مذہبی تحریکوں میں اس قدر بٹا ہوا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم قرآن حکیم کے مطالب کو سمجھتے اور سمجھاتے اور سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔ ہمارے اس فعل کا مطلب یہ ہے کہ ہم قرآن کے الفاظ کو اس علمی اور عقلی توجیہہ کا لباس پہنانا چاہتے ہیں جو ہمارے خیال کے مطابق ان کی اپنی صحیح توجیہہ ہے۔

سوم: یہ کہ خدا کی وحی ہمیں انسان اور کائنات کی حقیقت کے متعلق ایک صحیح نظریہ عطا فرماتی ہے اور فلسفہ کی صورت میں انسان کی عقل بھی انسان اور کائنات کا صحیح نظریہ بہم پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ عقل انسان کا یہ وظیفہ جو اس نے خود بخود اپنے لئے تجویز کر لیا ہے بیک وقت خدا کی وحی کا وظیفہ بھی ہے۔ لہٰذا عقل انسانی خدا کی وحی کے بیانات قبول کر لینے کے بعد بھی ان کو زیر غور لانے کی طرف مائل رہتی ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ جن سوالات کا قطعی جواب خدا کی وحی پہلے ہی دے چکی ہے یہ ان سوالات کا کوئی ایسا جواب بھی ڈھونڈ نکالے جو اس کے اپنے لئے بھی مکمل طور پر تسلی بخش ہو۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ کیا خدا فی الواقع موجود ہے؟ ایک آدمی اس سوال کے اس جواب پر جو خدا کی وحی نے دیا ہے مکمل یقین اور ایمان رکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک انسان کی حیثیت سے یعنی ایک صاحبِ عقل وفہم وجود کی حیثیت سے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس سوال کا وہ جواب بھی اپنے پاس موجود رکھے جو اس کی عقل اس کیلئے مہیا کرتی ہے۔ لیکن جب وہ ایسا کرے گا تو وہ مجبور ہوگا کہ دونوں کے جوابات کے اندر مطابقت پیدا کرے اور اسے قائم رکھے۔ ورنہ وہ دونوں سے پوری طرح مطمئن نہ ہو سکے گا۔

علمی ترقی کے ہر نئے دور میں اسلام کی نئی عقلی توجیہہ کی ضرورت

نوع انسانی کا ذہنی علم ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے اور نئے حکیمانہ افکار کے اس مجموعہ کے اندر جو کسی دور میں رونما ہوتا ہے حق باطل کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر دور میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اصلی اسلامی تحقیق کی طرف رجوع کر کے حق کو باطل سے الگ کیا جائے اور غلط اور

مخالف اسلامی حکیمانہ تصورات کی تردید کی جائے اور صحیح اور موافق اسلام حکیمانہ تصورات کو کام میں لاکر اسلام کی تائیدِ مزید اور حمایت اور مدافعت کی جائے۔ ہر دور میں اصلی اسلامی تحقیق کے ماہرین کے لیے یہ اہم کام موجود ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے نئے علمی افکار کے دانہ کو کاہ سے الگ کریں، دانہ کو کام میں لائیں اور کاہ کو پھینک دیں کہ ہوائیں اس کو اڑا کر لے جائیں۔

دورِحاضر میں اسلام کو حکیمانہ افکار کا چیلنج

تاہم علمی ترقی کے کسی دور میں بھی اسلام کو حکیمانہ افکار کی طرف سے ایسا زور دار اور خطرناک چیلنج کبھی نہیں دیا گیا جیسا کہ اب دورِحاضر کے حکیمانہ افکار نے دیا ہے۔ اس وقت فلسفی، ماہر تاریخ، ماہر اقتصادیات اور ماہر نفسیات سب مل کر اسلام کی جڑوں پر حملہ کر رہے ہیں، میکانکی ارتقاء تحلیل نفسی، حکمیاتی سوشلزم، تاریخی مادیت، منطقی اثباتیت، کرداریت اور موجودیت کے نظریات جن کی مقبولیت اس زمانہ میں ہر روز بڑھتی جا رہی ہے اور جو نوع انسانی کے اعمال و افعال کو نہایت تیزی سے متاثر کر رہے ہیں، ہمارے مذہب کی بنیادوں کو غلط قرار دے رہے ہیں۔ اگر ہم ان نظریات کے علمی چیلنج کا موثر جواب نہ دیں اور ان کی یقین افروز تردید نہ کریں تو ہم مسلمان کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے اور ان نظریات کا جواب دیتے ہوئے ہمیں اس بات کو بھی یاد رکھنا ہو گا کہ اگر ہمارا جواب دورِحاضر کے علمی معیاروں پر پورا نہ اتر سکے اور اپنے استدلال کے حقائق اور تکنیک اور طریقہ سے دنیا بھر میں چوٹی کے علماء اور حکماء کو مطمئن نہ کر سکے تو وہ ہرگز کوئی جواب نہ ہو گا۔ اس قسم کا جواب علماء کرام نے ابھی تک پیدا نہیں کیا۔ کہاں ہیں وہ بزرگان دین جن کو خدا نے مسلمانوں کی قیادت کے بلند مقام پر فائز کیا ہے اور جن کے نورِ ایمان اور زورِ قلم نے قرآن کی تفسیروں اور اسلامی کتابوں کے قابل قدر ذخیروں کا ڈھیر لگا دیا ہے؟ وہ کیوں اس خطرہ کو محفوظ نہیں کرتے؟ افسوس کہ وہی علماء دین جو کل تک اسلام اور کفر کی جنگ میں ہر محاذ پر اسلام کی مدافعت کے لیے پیش پیش رہتے تھے آج سو گئے ہیں اور اسلام کو جو نیا خطرہ درپیش ہے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو اس کے مقابلے کے لیے تیار کرنے کی کوشش کرنا تو درکنار اس کا ذکر تک نہیں کرتے۔ گویا اس کی موجودگی سے ہی ناآشنا ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم مفکرین بھی جو ہمارے مخالف ہیں۔ اس خطرہ سے ہماری غفلت اور اس کے مقابلہ میں ہماری عافیت کوشی اور سہل انگاری پر ہمیں طعنہ دے رہے ہیں۔ پروفیسر ڈبلیو

ڈی سمتھ نے اپنی کتاب ماڈرن اسلام ان انڈیا (MODERN ISLAM IN INDIA) میں لکھا ہے:

''جہاں دس یا بیس سال پہلے بازاروں کے موڑوں پر مذہبی مناظرے ہوا کرتے تھے اور تعلیم یافتہ مسلمان افکار جدید کے متعلق کتابیں پڑھ پڑھ اپنا سر کھپاتے تھے، آج مسلمان نوجوان ان علمی مشکلات سے بے خبر اور بے پروا ہے جو زندگی کے صحیح راستہ کی حیثیت سے مذہب کو پیش آتی ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح سے آزاد خیال مسلمانوں نے ان اعتراضات کا قریباً مکمل جواب دیا جو عیسائیوں نے اسلام پر وارد کئے تھے۔ آج تجدد پسند مسلمان اس جواب کو کافی سمجھتا ہے اور کوئی مسلمان ایسا پیدا نہیں ہوتا جو جواب دینا تو درکنار ان اعتراضات کا فقط ذکر ہی کرے جو اس زمانہ میں فلسفی، مورخ، ماہر نفسیات اور ماہر اجتماعیات نے اسلام پر اور سارے مذہب پر وارد کر رکھے ہیں۔ جس طرح انیسویں صدی کے کٹر مسلمان جو عیسائیوں اور آزاد خیال مغربیوں کے اعتراضات کا جواب دینے سے انکار کرتے تھے اور سر سید احمد اور امیر علی کو ان کا جواب دینے کی وجہ سے برا سمجھتے تھے، معاشرتی قدامت پسندی کا سہارا تھے اسی طرح سے وہ مسلمان بھی جو ان جدید اعتراضات کا جواب دینے سے قطع نظر کرتے ہیں، ان جماعتوں کی ہی اعانت کر سکتے ہیں جو معاشرتی اعتبار سے قدامت پسند ہیں۔''

مسلمانوں سے عصر جدید کے انسان کا مطالبہ

اسلام نے دور جدید کے انسان کے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا کر دیئے ہیں اور وہ مسلمانوں سے مطالبہ کر رہا ہے کہ وہ ان کا ایک ایسا جواب مہیا کریں جو مدلل اور حکیمانہ ہو اور اس قابل ہو کہ ایک ذہین اور تعلیم یافتہ آدمی کو قائل کر سکے۔ ان میں سے بعض سوالات یہ ہیں:

۱۔ کیا یہ بات درست نہیں کہ حقیقت کائنات مادی ہے اور روح مادہ کی ایک خاصیت ہے جو اس وقت رونما ہوتی ہے جب مادہ اپنی ترقی اور ترکیب کی ایک خاص حالت پر پہنچ جاتا ہے؟

۲۔ کیا یہ بات درست نہیں کہ مذہب فقط معاشی حالات کی پیداوار ہے اور خود اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا؟

۳۔ کیا انسان کی زندگی کا معاشی پہلو عمل تاریخ کا محرک نہیں اور کیا مذہب اس عمل تاریخ کی

ایک عارضی حالت اور ضمنی یا اتفاقی پیداوار نہیں؟

۴۔کیا مذہب دبی ہوئی جبلت جنس یار کی ہوئی حبِ تفوق یا اٹکی ہوئی غلبہ اور قوت کی خواہش کا غیر فطری اور بے محل اظہار نہیں؟

۵۔کیا مذہب ایک ظالم سوسائٹی کا مصنوعی دباؤ نہیں جو اپنی سلامتی کی خاطر فرد کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کچھ غیر فطری پابندیوں اور رکاوٹوں کو جنہیں وہ مذہبی اور اخلاقی اصولوں کا نام دیتی ہے اپنے آپ پر عائد کرے؟

۶۔کیا یہ درست نہیں کہ عمدگی اخلاق ایک نسبتی اصطلاح ہے جس کے معنی مختلف قوموں کے لیے اور مختلف حالات کے اندر مختلف ہوتے ہیں؟

۷۔کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کسی انسان پر وحی نازل کرے یا کوئی انسان سچ مچ نبی بن جائے؟

۸۔کیا نبوت (اگر وہ درحقیقت ممکن ہے) ایک ایسا عارضی اہمیت کا واقعہ نہیں جو نوع انسانی کی تا قیامت ترقی کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھ سکتا؟

۹۔کیا انسان کی عقل اسے اپنا نیک و بد سمجھانے کے لیے کافی نہیں کہ کسی بیرونی رہنمائی کی ضرورت ہو؟ جب انسان کو عقل دی گئی ہے تو اس نبوت کی خاص ضرورت کیا ہے؟

۱۰۔اگر نبوت کوئی ضروری چیز ہے تو یہ ختم کیوں ہو جاتی ہے اور تا قیامت انسان کی رہنمائی کے لیے نئے نئے انبیاء کیوں آتے نہیں رہتے؟ وغیرہ

ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان سوالات کا ایسا جواب تلاش کریں جو نہ صرف اسلام کی بنیادی تعلیمات کے مطابق ہو بلکہ پوری طرح سے مدلل اور معقول اور حکمیاتی (Scientific) ہو اور کم از کم ان تمام جوابات سے زیادہ معقول اور قابل قبول ہو جو دوسرے مذاہب یا نظریات کے ماننے والے ان ہی سوالات کیلئے پیش کر رہے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب امت مسلمہ کے ضمیر نے غیر واضح طور پر ہی سہی لیکن اس بات کو محسوس کر لیا ہے کہ اگر ہم اس قسم کا جواب جو درحقیقت اسلام کی مکمل اور منظم حکمیاتی تشریح سے کم نہیں ہوگا، فی الفور مہیا نہ کریں تو ایک نظریاتی جماعت کی حیثیت سے ہماری زندگی خطرہ میں ہے۔یہی سبب ہے کہ اس وقت قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلامی تحقیق کی ضرورت کا ایک عام احساس پیدا ہو گیا ہے۔ (جاری ہے)

تعلیم و تحقیق سید خالد جامعی

مطالعۂ مغربی فکر و تہذیب

مآخذ و کتابیات (اُردو، عربی، انگریزی)

(آخری قسط)

مغربی مصنفین و مفکرین کی درج ذیل کتابوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے:

[1] *BEYOND THE POSTMODERN MIND* BY HUSTON SMITH.

[2] *THE RISE AND FALL OF THE GREAT POWERS* . BY PAUL KENNEDY.

[3] *THE END OF THE HISTORY AND THE LAST MAN* BY FUKUYAMA.

[4] *THE WORLD IN COLLISION* EDITED BY KEN BOOTH AND TIM DUNNE.

[5] *HOLY WAR* BY KAREN ARMS STRONG.

[6]THE ANATOMY OF HUMAN DESTRUCTIVENESS BY ERIC FROMM.

[7] *MUSLIMS AND THE WEST* . EDITORS ANSARI ZAFFER ISHAQ AND JOHN ESPOSITO.

فکر و فلسفہ و تہذیب مغرب کا رعب عموماً سائنس و ٹیکنالوجی کے ذریعے بٹھایا جاتا ہے جدیدیت پسند مفکرین مغرب کی سائنس و ٹیکنالوجی سے بے حد مرعوب ہیں اور اس کا کوئی متبادل نہیں پاتے سوائے اس کے کہ عالم اسلام کسی بھی طریقے سے مغرب کی اس ترقی کو حاصل کرے ان مفکرین کو سائنس و ٹیکنالوجی کے مباحث سے متعلق درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ ان کا خلجان دور ہو سکے اور امت ان کے افکار کی اڑائی گئی گرد سے باہر نکل سکے، یہ کتابیں ان لوگوں کے لیے بھی مفید ہیں جو ابھی تک سائنس اور ٹیکنالوجی کے سحر سے باہر نہیں آسکے اور امت مسلمہ کی نجات، فلاح، فوز کا تصور سائنس کے بغیر کرنے سے عاجز ہیں۔ مدارس عربیہ کے طلباء اور علماء کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ بہت سے اشکالات دور کر دے گا اور مغرب کے مقابلے میں انھیں اعتماد و یقین عطا کرے گا۔ اس دور کا المیہ یہ ہے کہ ہم مغرب کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو

اعتماد و یقین کی دولت سے محرومی بھی ہمارے ساتھ ہوتی ہے۔ ہم اندر سے خائف ہیں اور اپنے خوف کو صرف خطابت سے چھپاتے ہیں۔ ہمیں یقین کی ضرورت ہے، ایسا پختہ یقین جو اس ایمان سے پھوٹے کہ مغرب باطل ہے، اسلام الحق ہے اس کے بعد یقین کی علمی بنیادیں تلاش کی جائیں لیکن یقین علم سے مشروط نہیں ایمان سے مشروط ہے۔

1. Discourse on Method and the Meditations by Rene Descartes, translated by F. E. Sutcliffe
2. Crises of European Sciences by Edward Husserl. Mathematical Principles of Natural Philosophy.
3. Science A History, by John Gribbin
4. Newton to Einstein by Ralph Baicelain.
5. A History of Science by William Dampier
6. Galileo at Work by Stillman Drake
7. Issac Newton by Rupert Hall
8. Nicholas Copernicus by Josef Rednicbi.
9. The Scientific Work of Rene Descartes by J. F. Scott.
10. The Scientific Revolution by Steven Shapin
11. Science and the Modern World by A. N. Whitehead
12. Foresight and understanding by Stephen Toulmin
13. Philosophy of Science by Alexendar Bird
14. What is this thing called science by A. F. Chalmer
15. Between Science and Metaphysics by S. Amsterdamski
16. Belief, Truth and Knowledge by D. M. Armstrong
17. Truth and Logic by A. J Ayer
18. Two Paradigms of Scientific Knowledge by D. Bloor
19. The Natural Philosophy of Galileo by Maurice Clavelin
20. Feyerabends Discourse against Method by J. Curfhoys and W. Suchting
21. On Scientific Method by J. J. Daires

22. How to defend Society against science by P. K. Fayerabend
23. Two New Sciences by Galileo Galilei
24. Philosophy of Natural Science by C. G. Hampel
25. Treatise on Human Nature by D. Hume.
26. Metaphysics and Measurement by A. Koyre
27. The structure of Scientific Revolution by T. Kohn.
28. Proofs and Refutation by Z. Lakatos
29. The logic of Scientific Discovery by Karl Popper.
30. Science and Subjectivity by Israel Scheffler

(۵۱)جمال پانی پتی کی کتاب ''جدیدیت کی ابلیسیت''

(۵۲) ادبی رسالے'' مکالمہ'' کے متفرق شمارے جن میں جدیدیت پر جمال پانی پتی اور دیگر مفکرین کے قیمتی مضامین مل جاتے ہیں۔''مکالمہ'' جناب مبین مرزا کی زیرادارت شائع ہوتا ہے اور جدیدیت کا سخت ناقد لیکن نہایت علمی وتحقیقی وادبی رسالہ ہے۔

(۵۳)ضمیر علی بدایونی ''جدیدیت اور پس جدیدیت''

(۵۴) جریدہ ''روایت وتہذیب'' اور جریدہ ''روایت'' کے چھ شمارے۔ جو سہیل عمر اور سراج منیر کی زیرادارت شائع ہوئے۔ ان میں بعض مضامین نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

(۵۵) جریدہ ''اعلام'' لاہور شمارہ ۳ جس میں محمد حسن عسکری کی کتاب مغربی فکر کی گمراہیوں کا خاکہ پر جناب ڈاکٹر ساجد علی نے ''محمد حسن عسکری کا تصور روایت و مابعد الطبیعیات'' کے نام سے نہایت عالمانہ نقد کیا ہے۔

(۵۶) ماہنامہ فنون میں محمد عسکری کی کتاب ''جدیدیت'' اور اس کے متعلقات پر محمد ارشاد کے ناقدانہ مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

(۵۷)غرب زدگی (فارسی) جلال آل احمد تہران۔ انقلاب ایران کے زمانے کی مقبول ترین کتاب

(۵۸)ڈاکٹر علی محمد رضوی کا ایم فل کا مقالہ

[1] Focault on Freedom[2] Methodology underlying Imam Ghazali's critique of Greek Philosphy.(مطبوعہ جریدہ ۲۹)

(۵۹) ڈاکٹرعبدالوہاب سوری کا پی ایچ ڈی مقالہ Philosophical analysis of Rawl's Theory of Justice. (مطبوعہ جریدہ ۳۴)

(۶۰) الفکر الاسلامی الحدیث وصلتُه بالاستعمار الغربی:الدکتور محمد البھی

(۶۱) شاہنواز فاروقی کے کالموں کا مجموعہ ''کاغذ کے سپاہی'' اور ایم اے کے لئے لکھا گیا تحقیقی مقالہ ''سلیم احمد''، مغربی فکر و فلسفے کے بہت سے پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے۔ ''سلیم احمد'' والے مقالے میں تہذیب مغرب کی کشمکش سے ابھرنے والے بے شمار سوالات پر غور وفکر کا موقع میسر آتا ہے۔

(۶۲) قصة الایمان بین الفلسفة و علم القرآن:مفتی طرابلس الشیخ ندیم الجسر

(۶۳) ہائیڈیگر کی درج ذیل کتابیں:

[1] Being & Time [2] Question Concerning Technology.

(۶۴) اسلام پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر: ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی

(۶۵) ارکان اربعہ: ابوالحسن علی ندوی

(۶۶) تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب: ابوالحسن علی ندوی

(۶۷) دائرۃ المعارف الاسلامیہ جامعہ پنجاب۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں مسلم فلاسفہ اور ان کے افکار ونظریات کے سلسلے میں اہم معلومات مل جاتی ہیں۔

(۶۸) معتزلہ کی تاریخ زبدی حسن جاراللہ پیش لفظ الفرڈ گیوم

(۶۹) الملل و النحل: ابن حزم اندلسی، ترجمہ عبداللہ العمادی

(۷۰) الملل و النحل: شہرستانی ترجمہ پروفیسر علی محسن صدیقی

(۷۱) الفرق بین الفرق: عبدالقاہر بغدادی

(۷۲) العقل و النقل: علامہ شبیر احمد عثمانی

(۷۳) قرآن حکیم کے وہ تمام متداول تراجم اور تفاسیر جوامت مسلمہ کے مسلمہ مکاتب فکر کے ہاں رائج ہے۔

(۷۴) ٹونی کی کتاب Religion and Rise of Capitalism

(۷۵) میکس ویبر Capitalism and Protestant Ethics

(۷۶) بیرنگٹن مور Social Organs of Dictatorship and Democracy

Lord and Peasent in the Making of Modren World.

(۷۷) رکسانہ لیوبن Enemy in the mirror

(۷۸) ڈاکٹر ڈیوڈ میکے Critique of Modernity

(۷۹) جرگین ہیبر ماس The Philosophical Discourse of Modernity

(۸۰) مغربی فکر و فلسفے کے التہاب والحاد سے پیدا ہونے والے اضطراب نے عالم اسلام کے مفکرین کو کس طرح متاثر کیا اور بڑے بڑے علماء وفضلاء کس طرح جدیدیت میں ڈوب گئے اور مغرب کی چکا چوند میں بہہ گئے۔ اس کا جائزہ بھی ضروری ہے اس سلسلے میں نیاز فتح پوری، علامہ مشرقی، غلام احمد پرویز، سرسید احمد خان، غلام جیلانی برق کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے، جس سے مغربی یلغار کے اثرات کا اندازہ ہوگا۔ مغرب سے علمی سطح پر متاثر ہونے والے افراد کے تشکک اور تذبذب کا گہرا جائزہ لینے کے لیے علامہ اقبالؒ، احمد سعید اکبر آبادی، ڈاکٹر فضل الرحمن (سابق سربراہ ادارہ تحقیقات اسلامی) اور ڈاکٹر منظور احمد (سابق ریکٹر اسلامی یونیورسٹی) کی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے، اس مطالعے کے دوران یہ واضح ہو جائے گا کہ ڈاکٹر فضل الرحمن، ڈاکٹر منظور احمد، غلام احمد پرویز اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے تمام متجددین اور جدیدیت پسند علماء کی فکر علامہ اقبالؒ کے خطبات کے اعادہ سے زیادہ نہیں ہے اور خطبات کی تشکیک پر اپنے فکر و نظر کی عمارت تعمیر کرنا ان تمام جدیدیت پسندوں کا طرہ امتیاز ہے۔ اور تمام جدیدیت پسند مفکرین کی فکر عصر حاضر میں پیدا ہونے والے مسائل کو مذہب کے دائرے میں حل کرنے کا دعویٰ کرتی ہے اور اس عمل کے دوران یہ بھول جاتی ہے کہ دین اور اس کی تمام روایات دور از کار تاویلات کے نتیجے میں جدیدیت کی بھول بھلیوں میں نہ صرف گم ہو جاتی ہیں بلکہ اس طرح تحلیل ہوتی ہیں کہ اگلی نسل میں ان کا سراغ بھی نہیں ملتا۔ مفتی عبدہٗ کے شاگرد رشید رضا کی وہ تحریریں پڑھ لی جائیں جو طٰہ حسین جیسے بے شمار عبدہ کے شاگردوں کے الحاد کے رد عمل میں لکھی گئیں، اس ضمن میں علامہ اقبال کے خطبات 'تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' جاوید غامدی کی 'اسلام کیا' ہے جو ان کے شاگرد ڈاکٹر محمد فاروق خان کے نام سے شائع ہوئی ہے، کا مطالعہ ضروری ہے (ڈاکٹر منظور احمد اور ڈاکٹر جاوید

اقبال ان جدیدیت پسند دانشوروں میں شامل ہیں جو نہ عربی جانتے ہیں نہ فارسی ان کے علمی افلاس کا عالم یہ ہے کہ ان کی کتابوں میں کسی عربی فارسی کتاب کا حوالہ نہیں ملتا، مگر دین پر اعتراضات میں یہ لوگ نہایت جری ہیں) عالم اسلام کا المیہ یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ سے لے کر جسٹس جاوید اقبال اور ڈاکٹر منظور احمد تک ایک بھی جدیدیت پسند مفکر نہ اسلامی علوم پر عبور رکھتا ہے نہ عربی زبان سے گہری واقفیت، لیکن سب کو اجتہاد کا لپکا ہے۔

(۸۱) اقبال شناسی: ڈاکٹر منظور احمد (۸۲) اسلام چند فکری مسائل: ڈاکٹر منظور احمد

(۸۳) نیاز فتح پوری کی 'خدا اور تصور خدا' (یہ نگار کا خدا نمبر ہے جو سرقہ کیا گیا تھا۔ اس سرقے کی تفصیل ماہنامہ الدعوۃ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے شمارہ ۱۲، جلد ۵ میں ملاحظہ کیجیے)۔

(۸۴) مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، من و یزداں ۔ یہ کتابیں ڈاکٹر منظور احمد کے الحادی منہاج میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں اور ڈاکٹر صاحب نے ایک خطبے میں ان کتابوں کو جدید فکر اسلامی کی تشکیل میں اہم مقام دیا ہے۔

(۸۵) عورتوں کے امتیازی مسائل اور قوانین۔ حکمتیں اور قواعد، حافظ صلاح الدین یوسف

(۸۶) فکریات، ترجمہ وترتیب تحسین فراقی

(۸۷) مسلمان اور مغربی تعلیم پاک و ہند میں، پروفیسر سید محمد سلیم

(۸۸) مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، پروفیسر سید محمد سلیم

(۸۹) برصغیر پاک و ہند میں غیر ملکی زبانوں کے ماہر علماء، پروفیسر سید محمد سلیم

(۹۰) اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، سید قطب

ڈیکارٹ سے لے کر عہد حاضر کے عظیم فلسفی ڈلیوز تک اہم فلاسفہ کی کتابیں جس کے بغیر مغرب کا کلی ادراک محال ہے۔

(۹۱) Baruch spinoza: ETHICS

[1] Gottoried Wilhelm von Leibnize: [2] DISCOURSE ON METAPHYSICS

[3] MORADOLOGY

(۹۲) جان لاک [John Lock]

[1] AN ESSAY CONCERNING HUMAN UNDERSTANDING [3] A LETTER CONCERNING TOLERATION [3] CONCERNING CIVIL GOVERNMENT.

(۹۳) George Berkeley کی کتاب

THE PRINCIPLES OF HMAN KNOWLEDGE.

(۹۴) David Hume

[1] AN INQUIRY CONCERNING HUMAN UNDERSTANDING [2]DIALOGUES CONCERING NATURAL RELIGION.

(۹۵) Immauel Kant:

[1] CRITIQUE OF PURE REASON [2]CRITIQUE OF PRACTICAL REASON [3] CRITIQUE OF JUDGMENT [4]GROUNDWORK OF THE METAPHYSICS OF MORALS [5]WHAT IS ENLIGHTENMENT

(۹۶) George Fridrich Hegel

[1] PHILOSOPHY OF RIGHT [2] PHILOSOPHY OF HISTORY [3]PHENOMENOLOGY OF MIND

Karl Marks, Das Capital (4 vols)

(۹۷) Friedrlch Nietzsche:

[1] THE BIRTH OF TRAGEDY [2] UNTIMELY MEDITATIONS [3] THUS SPOAKE ZERATHUSTRA [4] THE GENEALOGY OF MORALS [5] BEYOND GOOD AND EVIL.

(۹۸) Ayer, Alfred Jules: Language, Truth and Logic.

Derrida, Jacques

[1] OF GRAMMATOLOGY. [2] WRITING AND DIFFERENCE. [3]MARGINS OF PHILOSOPHY.

(۹۹) Dewey, John

[1] RECONSTRUCTION IN PHILOSOPHY. [2] THEORY OF VALUATION.

[3] HUMAN NATURE AND CONDUCT.

(۱۰۰) Dilthey, Wilhelm: INTRODUCTION TO THE HUMAN

SCIENCES.
(۱۰۱) Foucault, Michel
[1] MADNESS AND CIVILIZATION [2] THE ORDER OF THINGS [3] THE ARCHAEOLOGY OF KNOWLEDGE [4] DISCIPLINE AND PUNISHMENT
(۱۰۲) Gadamer,Hans, George: [1] TRUTH AND METHOD.
Habermas, Jurgen
[1] THE PHILOSOPHICAL DISCOURSE OF MODERNITY [2]THE THEORY OF COMMUNICATIVE ACTION (2 VOLS)
(۱۰۳) Heideger, Martin
[1] BEING AND TIME [2] QUESTION CONCERNING TECHNOLOGY.
(۱۰۴) Husserl, Edmun [1] LOGICAL INVESTIGATIONS
James, William
[1] THE VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE [2]PRAGMATISM
(۱۰۵) Peirce, Charles: [1] SOME CONSEQUENCES OF FOUR CAPACITIES.
(۱۰۶) Popper, Karl
[1] OBJECTIVE KNOWLEDGE [2] THE OPEN SOCIETY AND ITS ENEMIES
(۱۰۷) Rawls, John
[1] A THEORY OF JUSTICE. [2] POLITICAL LIBERALISM
(۱۰۸) Ricoeur Paul
[1] HISTORY AND TRUTH [2] THE CONFLICT OF INTERPRETATION [3] THE ROLE OF METAPHOR.
(۱۰۹) Rorty, Richard
[1] CONTINGENCY, IRONY AND SOLIDARITY [2]OBJECTIVITY, RELATIVISM AND TRUTH
(۱۱۰) Wittgensteien, Ludwigl
[1] PHILOSOPHICAL INVESTIGATION
(۱۱۱) Gilles Deleuze and Felix Guttari

[1] ANTI OEDIPUS [2] THOUSAND PLATEOUS [3] WHAT IS PHILOSOPHY.

(۱۱۲) درج ذیل مطبوعات کا مطالعہ بھی سودمند رہے گا۔

☆ جریدہ ۲۲ ☆ جریدہ ۲۳ ☆ جریدہ ۲۴ ☆ جریدہ ۲۵ ☆ جریدہ ۲۸ ☆ جریدہ ۲۹ ☆ جریدہ ۳۰ ☆ جریدہ ۳۲ ☆ جریدہ ۳۳ ☆ جریدہ ۳۴ ☆ جریدہ ۳۵ ☆ جریدہ ۳۶: مرتبہ ،شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی (۱۱۳) ماہنامہ ساحل کراچی کا خاص موضوع مغربی تہذیب فلسفہ تاریخ کا ناقدانہ جائزہ ہے اس کی تمام فائلیں سودمند رہیں گی (۱۱۴) اسلام اور جدید سائنس نئے تناظر میں: محمد ظفر اقبال، کتاب محل لاہور (۱۱۵) اسلام اور جدیدیت کی کشمکش: محمد ظفر اقبال

(۱۱۴) مغربی فکر وفلسفے سے متعلق تعارفی مباحث، مغربی فلسفیوں کے تعارف، مغربی فلسفہ پر سرسری نقد کے لیے درج ذیل ویب سائٹس کا مطالعہ مفید رہے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ عالم اسلام میں اٹھنے والے عصری فتنوں، متجددین کے افکار، راسخ العقیدہ علماء کے الحادی افکار سے واقفیت کے لیے بھی درج ذیل ویب سائٹس سے قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

www.falsafeh.com
fallosafah.org
www.halgheh.com
www.muslimphilosophy.com
www.alwaraq.net
plato.stanford.edu
www.enashir.com/blogs/tarik
www.jozoor.net
books.mirror.org
www.magiran.com
www.hupaa.com
www.sunna.org
pless.arabandalucia.com
www.osraty.com
www.khaled-alfaisal.com
www.lahdah.com
www.noo-problems.com
www.peykarandeesh.org/article
www.caricadonya.com
www.nizwa.com
www.arabworldboks.com/articles
www.shahnawazfarooqui.com

اس ویب سائٹ پر شاہنواز فاروقی صاحب کے تمام کالم اور علمی کام میسر ہے، مغرب پر بعض تنقیدی مضامین علماء کرام کے لیے نہایت معلوماتی اور کارآمد ہیں۔ عام لوگوں کے لیے شاہنواز صاحب کے کالم نہایت آسان اور شگفتہ زبان میں لکھے جاتے ہیں اور علمی افراد کے لیے ان کی علمی شان بھی ہوتی ہے۔

اسلام اور مغرب

پروفیسر محمد انور صادق①

اسلام، سیکولرازم اور اقبال

اسلامی دنیا میں سیکولرازم کو فروغ دینا بھی عالمی نظام کے اہداف میں شامل ہے۔ جس کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی خیرخواہی بیان کیا جاتا ہے۔ دنیا میں عالمی نظام نافذ کرنے والوں کے نزدیک یورپ اور امریکہ کی ترقی اور خوش حالی کا راز چونک سیکولر نظامِ حیات کے اختیار کرنے میں پوشیدہ ہے اس لیے وہ اپنے تجربے کی روشنی میں مسلم معاشروں سے بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے ہاں بھی سیکولر نظام حیات کو رواج دیں گے۔ امریکہ اور یورپ کی عالمی قیادت کی رائے میں مسلمانوں کی پسماندگی کی اصل وجہ چونکہ ریاست کے معاملات میں مذہب کی بے جا مداخلت ہے اس لیے اگر اسلامی دنیا کے لوگ بھی آزادی اور خوش حالی کی منزل سے ہم کنار ہونا چاہتے ہیں تو انہیں بھی امریکہ اور یورپ کی پیروی میں مذہب کو ریاستی امور سے جدا کرنا ہوگا۔

نیا عالمی نظام نافذ کرنے والوں کی جانب سے مسلمان معاشروں میں سیکولرازم کے فلسفے کو رواج دینے کا مشورہ یا زیادہ بہتر الفاظ میں فیصلہ اس دلیل کی بنا پر کہ یورپ اور امریکہ کی ترقی اور خوش حالی کا راز اس فلسفے کی ترویج میں پوشیدہ ہے جو کسی صورت بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا کرنے سے مسلم معاشروں کو نہ صرف اپنے دینی اصولوں سے ہاتھ دھونا پڑیں گے بلکہ ایسا کرنے میں اُن کے تہذیبی تشخص کے مٹنے اور قومی تسلسل کے ٹوٹنے کا اندیشہ بھی موجود ہے۔ جب کہ اقبال کے ہاں اس دور میں مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہی اپنے تہذیبی تشخص اور قومی تسلسل کو قائم رکھنا ہے۔ جسے ہم سیکولر نظام حیات کو اپنا کر قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے غیروں کی جانب سے ترقی اور خوش حالی کے نام پر سیکولر نظام حیات کو اختیار کرنے کا مشورہ قبول کرنے سے پہلے ہمارے روشن خیال حکمرانوں اور سیکولر ذہن رکھنے والے دانشوروں کو اقبال کے اس مشورے پر بھی غور کرنا ہوگا جس میں وہ کسی تصور یا فلسفے کی پیدائش کے تاریخی پس منظر کو جاننا از حد ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال نے فرمایا:

''فکری ارتقا کو انسانی فعلیت کے دیگر پہلوؤں سے منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ فلسفہ کی کتابیں ہمیں یہ تو بتاتی ہیں کہ مختلف قوموں نے کیا سوچا ہے لیکن اُن مختلف معاشرتی اور سیاسی

① جڑانوالہ

اسباب وعوامل کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات فراہم نہیں کرتیں جن سے فکر انسانی کا کردار متعین ہوا فلسفے کی جامع تاریخ مرتب کرنا یقیناً ایک دشوار کام ہوگا۔"[۱]

اقبال کے حوالے سے فلسفے کی تاریخ نویسی کا جو اہم اصول ہم نے بھی اوپر بیان کیا ہے جب ہم اُس کی روشنی میں سیکولرازم کے تاریخی پس منظر کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نظام حیات کی تشکیل میں کم ازکم چار بڑے واقعات نے نمایاں کردار ادا کیا ہے جنہیں یورپ کی تاریخ میں عام طور پر رینے ساں، ریفارمیشن، روشن خیالی کی تحریک اور صنعتی انقلاب کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ راقم کے خیال میں اگر یورپ کی تاریخ میں یہ واقعات رونما نہ ہوتے تو شاید سیکولرازم کا ظہور بھی عمل میں نہ آتا۔ بہرحال ان واقعات پر روشنی ڈالنے سے پہلے یورپ کی اُس تمدنی حالت کا شعور حاصل کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں اُس وقت وہاں کے لوگ اپنی زندگی بسر کررہے تھے اور جس کے خلاف ردِعمل کے طور پر سیکولر خیالات کا ظہور عمل میں آیا اور جس کے نتیجہ میں یورپ کے لوگوں نے عیسائیت کے عنصر کو جو وہاں کی غالب اکثریت کا مذہب تھا رفتہ رفتہ ریاست کے معاملات سے خارج کرنا شروع کردیا اور یوں سیکولر ازم کے فروغ کا راستہ ہموار ہوتا چلا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ یورپ کی تاریخ میں عیسائیت کا آغاز رومی سلطنت کے زیر سایہ ہوا تھا جس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ خدا کا حق خدا کو دو اور سیزر کا حق سیزر کو دو جو گویا اِس امر کا اعلان تھا کہ مذہب اور ریاست دو جدا جدا معاملات ہیں جنہیں ایک دوسرے میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔ تاہم مذہب اور ریاست کی یہ جدائی اُس وقت اپنے اختتام کو پہنچ گئی جب قسطنطین نے عیسائیت کا مذہب اختیار کرلیا اور دونوں اداروں کو ملا کر ایک کردیا جس کا نتیجہ ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر کے الفاظ میں یہ برآمد ہوتا ہے کہ یورپ کے ہر ملک میں دہری حکومت تھی ایک تو مقامی یعنی دینوی حکومت اور دوسری غیر ملکی حکومت جس کے اقتدارارت کا مصدر ومرکز پاپائے روما تھا۔ روما کے اثر کا مقامی اثر پر غالب ہونا ایک لازمی امر تھا۔[۲] چنانچہ چرچ اور سٹیٹ کے اِس گٹھ جوڑ کے اثرات یورپ کے تمدنی حالت پر کیا مرتب ہوئے اس کا اندازہ ہمیں مشہور اشترا کی دانش ور سید سبط حسن کے اس اقتباس سے بخوبی ہوسکتا ہے جو اُن کے ایک مضمون ''تھیوکریسی'' سے لیا گیا ہے

---

[۱] ڈاکٹر جاوید اقبال، شذرات فکر اقبال، مجلس ترقی ادب، ۲ کلب روڈ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص:۱۱۱

[۲] مولانا ظفر علی خان (مترجم)، معرکہ مذہب وسائنس، الفیصل تاجران کتب، لاہور، ص:۳۸۱

جس میں وہ بجا طور پر تحریر کرتے ہیں:

مغربی مورخین کلیسا کے ہزار سالہ اقتدار کو عہد تاریک سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ وہاں چوتھی صدی سے چودھویں صدی تک تعصب، تنگ نظری اور توہم پرستی کا اندھیرا چھایا رہا۔ کلیسا نے عقل وخرد پر پہرے بٹھا رکھے تھے اور کسی کی مجال نہ تھی کہ کلیسائی عقائد سے سرِ مو اختلاف کرسکے۔ ہر جگہ مذہبی عدالتیں قائم تھیں۔ یورپ کا ہر فرد بشر جس کو بادشاہوں کی براہ راست سرپرستی حاصل نہ تھی مذہبی عدالتوں کے خوف سے کانپتا رہتا تھا۔[1]

قرون وسطیٰ میں یورپ کے عام تمدنی حالات کے بارے میں کچھ ایسی ہی رائے کا اظہار ڈاکٹر مبارک علی نے بھی اپنی کتاب ''یورپ کی تاریخ'' میں ان الفاظ میں کیا ہے:

چرچ اور مذہبی عقائد نے قرونِ وسطیٰ ے معاشرے کو اس قدر سختی سے جکڑ رکھا تھا کہ پڑھے لکھے تعلیم یافتہ لوگ اس کی تعلیمات کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ سائنس دان اپنی تحقیق کی بنیاد علم پر نہیں بلکہ مفروضوں پر رکھتے تھے کیونکہ اوّل تو انہیں تجربات کی سہولت نہیں تھی۔ دوم اُن کے تجربات مذہبی عقائد سے ٹکراتے تھے۔ اس لیے وہ مذہب سے منحرف ہونے پر گھبراتے تھے۔[2]

اس مقام پر اگر قرونِ وسطیٰ میں یورپ کی عام سماجی حالت کا خلاصہ بیان کر دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ چنانچہ اُس وقت کے یورپ کا معاشرہ مکمل طور پر چرچ، بادشاہ اور فیوڈل لارڈز کے مشترکہ تسلط میں جکڑا ہوا تھا جنہوں نے نہ صرف عوام کے فکر ونظر کی آزادی کو سلب کر رکھا تھا بلکہ یورپ کا پورے کا پورا معاشرہ بھی جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا لیکن ''ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں'' کے مصداق دنیا میں کوئی معاشرہ بھی زیادہ دیر تک ایک حالت پر قائم نہیں رہ سکتا اور اُس میں تبدیلی کا رونما ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی کچھ یورپ کے ساتھ بھی ہوا اور وہاں جلد ہی رینے ساں (Renaissance) کی تحریک جسے اُردو میں تحریک احیائے علوم کا نام دیا جاتا ہے، کا آغاز ہوا جس کے نتیجہ میں لوگوں میں نئے نئے علوم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا اور انھوں نے چرچ کی اتھارٹی کو چیلنج کرنا شروع کر دیا کیونکہ اب اُنہیں نئے سائنسی علوم کے

[1] سید سبط حسن، نوید فکر، مکتبہ دانیال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی، ۲۰۰۲ء، ص: ۲۳

[2] ڈاکٹر مبارک علی، یورپ کا عروج، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص: ۹۰

حقائق جنہیں عام طور پر مشاہدات کے بنیاد پر اخذ کیا جاتا تھا براہِ راست مذہبی عقائد سے متصادم دکھائی دینے لگے تھے۔ چنانچہ یورپ کے رہنے والوں نے اس تصادم کا علاج سیکولرازم کے فلسفے میں تلاش کیا جس کی رو سے مذہب فرد کا ذاتی معاملہ قرار پایا اور اسے نہ صرف سائنس کی دنیا میں مداخلت سے روک دیا گیا بلکہ زندگی کے دوسرے امور سے بھی بے دخل کر دیا گیا۔

اس کے برعکس اقبال چونکہ مذہب اور سائنس کے درمیان تصادم کے خیال کو نہ صرف غیر اسلامی قرار دیتے ہیں بلکہ وہ ان دونوں قوتوں کے مابین ہم آہنگیوں کو تلاش کرنے کے آرزومند بھی ہیں اس لیے ہم اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ کم ازکم اسلام کی حدود میں سیکولرازم کو اختیار کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اقبال کی رائے میں مذہب اور سائنس کے درمیان تصادم کا جو خیال عام طور سے رواج پا گیا ہے وہ درست نہیں ہے اور اُس کا اطلاق دنیا کے تمام مذاہب پر یکساں طور پر نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے نزدیک تصادم کا یہ خیال عیسائیت کے پس منظر میں یورپ کے مخصوص حالات کی وجہ سے پیدا ہوا تھا جسے آنکھیں بند کر کے اسلام پر منطبق کرنا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہوگا۔ کیونکہ اقبال کے نزدیک دنیا میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جسے سائنسی علوم سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ چنانچہ اقبال نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ جیسی معرکہ آرا کتاب لکھ کر جہاں تصادم کے اس خیال کر تردید کی ہے وہاں انہوں نے مذہب اور سائنس کے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگیوں کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ بہر حال اقبال ۶ مارچ ۱۹۲۷ء کو اپنے ایک اخباری بیان میں مذہب اور سائنس کے تصادم پر اظہار خیال کرتے ہوئے بجا طور پر فرماتے ہیں:

سائنس اور مذہب کا تصادم غیر اسلامی ہے۔ قرآن کے ہر صفحہ پر انسان کو مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ علم حاصل کرنے کے تلقین کی گئی ہے.... ڈاکٹر ولیم جان ڈریپر کی تصنیف معرکہ مذہب اور سائنس اصل میں مذہب اور سائنس کی ہنگامہ آرائی کی مظہر نہیں بلکہ عیسائیت اور سائنس کے تصادم کی تاریخ ہے۔ اس تصادم کی وجہ یہ تھی کہ یورپ کے حکما اور علما مسلمانوں کی علمی ترقی سے متاثر ہوئے تو اہل فرنگ کے خیالات بھی زبردست انقلاب پیدا ہونے لگا اور رومن کیتھولک مذہب والے اس علمی انقلاب سے متصادم ہوئے۔ [1]

بہر حال تحریک احیائے علوم کے علاوہ یورپ کی تاریخ میں جس دوسری بڑی تحریک نے وہاں کے لوگوں کو سیکولرازم کا فلسفہ اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا وہ ریفارمیشن کی تحریک تھی جس کا بانی

[1] رفیق افضل (مرتب)، گفتار اقبال، ادارہ تحقیقات، دانشگاہِ پنجاب، لاہور، ص: ۲۳

مارٹن لوتھر نامی ایک شخص تھا جو ۱۴۸۳ء میں جرمنی کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ مارٹن لوتھر کی اس تحریک کا بنیادی مقصد دراصل عیسائیت کو اُس کی اصل روح کے مطابق ازسرِ نو بحال کرنا تھا جو خدا کی اطاعت اپنی جگہ اور بادشاہ کی اطاعت اپنی جگہ کے اصول پر مشتمل تھی۔ اب صاف ظاہر ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے معاشرے میں اس اصول کو ازسرِ نو بحال کرنا بغاوت سے کم نہ تھا کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں ریاست اور چرچ کے ہزار سالہ گٹھ جوڑ کے ٹوٹنے کا اندیشہ تھا جس کی زد براہِ راست کلیسا کے مفادات پر پڑ سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پوپ نے اپنے ایک فرمان میں لوتھر کے باغیانہ اقدامات کی پُرزور مذمت کی اور اُسے ایک ایسا جنگلی سور قرار دیا جو لارڈ کے باغ میں گھس آیا ہو لیکن اس سب کے باوجود جرمنی کے حکمرانوں نے جو پہلے ہی پوپ کی دخل اندازیوں سے تنگ آ چکے تھے لوتھر کا بھرپور ساتھ دیا اور پوپ کے ظلم سے اُس کی حفاظت کی۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ریفارمیشن کی اس تحریک سے یورپ کی سرزمین پر سیکولرازم کا پودا کیسے فروغ پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوتھر کی جارہ کردہ اس تحریک نے جہاں عیسائیت کو اُس کی اصل روح کے مطابق ازسرنو بحال کر دیا تھا وہیں اُس نے یورپ کے پورے معاشرے کو بھی مختلف قومی ریاستوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اب چونکہ نئی پیدا ہونے والی قومی ریاستوں کو منظم اور مستحکم کرنے میں کلیسا کے فراہم کردہ شرعی قوانین کارگر ثابت نہ ہو سکتے تھے لہٰذا نئے سرے سے قانون سازی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ اس قومی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے حکمرانوں کو یونان اور روم کے وضع کردہ سول قوانین کا سہارا لینا پڑا جو اپنی نوعیت میں بڑی حد تک سیکولر مزاج کے حامل تھے۔ اب جگہ جگہ لا کالج قائم ہو چکے تھے جن میں رومن لا کی تعلیم دی جاتی تھی تاکہ قومی ریاستوں کی روز افزوں قانونی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ دوسری طرف یہ تعلیم کلیسا کے حق میں بڑی مہلک ثابت ہوئی کیونکہ اس کی وجہ سے عدالتوں کا کردار بدل گیا تھا اور فیصلے مذہبی قوانین کی بجائے سیکولر قوانین کے تابع ہونے لگے اور یوں پورے کا پورا یورپین معاشرہ رفتہ رفتہ سیکولر نظامِ حیات کی گرفت میں آتا چلا گیا۔ اس صورتِ حال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سید سبط حسن بجا طور پر لکھتے ہیں:

'دوسرا اہم رجحان جس سے سیکولر عناصر کو تقویت ملی وہ مذہبی قوانین کی جگہ سول قوانین کی بڑھتی ہوئی مقبولیت تھی۔ اس رجحان کو بھی اٹلی کی جمہوری حکومتوں نے ہی سہارا دیا۔ چونکہ کلیسا کے وضع کردہ فرسودہ قوانین نئی زندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے تھے لہٰذا.... ہر جگہ لا کالج قائم

ہو گئے۔ ان درس گاہوں میں قدیم رومن لا کی تعلیم دی جاتی تھی۔'[۱]

اقبال جب مسلمانوں کے موجودہ تمدنی حالات کا موازنہ یورپ کے اُن تمدنی حالات سے کرتے ہیں جو لوتھر کے زمانے میں موجود تھے تو انہیں اِن دونوں معاشروں کے احوال میں گہری مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ تاہم وہ اس مماثلت کے باوجود مسلمانوں کی اصلاح لوتھر کے انداز میں کرنا پسند نہیں کرتے۔ راقم کے نزدیک اس کی بنیادی وجہ اصلاحی نقطہ ہائے نظر کا وہ اختلاف ہے جو اسلام اور عیسائیت کی ماہیت کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ از روئے اسلام دین کا تعلق انسانی زندگی کے تمام شعبوں سے ہے جب کہ عیسائیت میں دین اور دنیا الگ الگ معاملات ہیں اور انہیں ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام میں اصلاحی کوششیں دین و دنیا کی یک جائی پر جب کہ عیسائیت میں ان دونوں کی جدائی پر منتج ہوتی ہیں۔ اب چونکہ یورپ میں لوتھر نے عیسائیت کو اُس کی اصل روح کے مطابق بحال کر کے زندگی کے دیگر شعبوں کو سیکولر نظام حیات کے حوالے کر دیا تھا اس لیے اُس کا یہ تجربہ اسلامی دنیا میں دہرایا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اقبال اسلام میں دین و دنیا کی یک جائی کے تصور پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے الہ آباد والے خطبے میں فرماتے ہیں:

'اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے مربوط و منسلک ہے جو خود اُس کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ اگر ایک کو رد کیا گیا تو دوسرا خود بخود مسترد ہو جائے گا۔ اس لیے ایک مسلمان اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ نظامِ سیاست کو ایسے قومی خطوط پر مرتب کیا جائے جس سے اسلام کے اصول اتحاد کی نفی ہو جائے۔'[۲]

احیائے علوم اور اصلاح مذہب کی ان زوردار تحریکوں کے بعد جس تیسری تحریک نے یورپ کے مزاج کو زیادہ سے زیادہ سیکولر بنانے میں معاون کا کردار ادا کیا ہے اسے روشن خیالی (Enlightenment) کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ روشن خیالی کی یہ تحریک ہالینڈ اور انگلستان سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ سارے یورپ میں پھیلتی چلی گئی اور بالآخر فرانس میں اپنے عروج کمال تک جا پہنچی۔ انگلستان میں اس تحریک کا آغاز بیکن، ہابز اور لاک وغیرہ کی تجربیت پسندی سے ہوا تھا جب کہ فرانس میں اسے والٹیر اور اُس کے قاموسی رفقا نے پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ جرمنی میں اس تحریک کا باعث ریفارمیشن سے مایوسی اور مذہبی تنازعات تھے۔ اس لیے

---

[۱] سید سبط حسن، نوید فکر، ص: ۸۷

[۲] محمد جہانگیر عالم (مترجم)، اقبال کا خطبہ الہ آباد در اقبال، (جولائی ۱۹۸۴ء)، ص: ۶۰

لوگ عقل کی جانب لوٹے اور فطرتی مذہب اور رواداری کے حامی بنے۔ اِن لوگوں میں ولف اور لیسنگ وغیرہ شامل تھے۔ بہر حال روشن خیالی کی یہ تحریک جن اصولوں پر قائم کی گئی تھی اُن کا خلاصہ حسبِ ذیل نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ انسان فطرت پر قابو پا سکتا ہے۔

۲۔ خدا کی ذات سے انکار نہیں مگر اُس کی بنائی ہوئی کائنات کو سمجھنا ضروری ہے۔

۳۔ انسان خدا سے آزاد ہے۔

۴۔ لوگوں پر حکمرانوں اور بادشاہوں کی بجائے قواعد وضوابط کے ذریعہ حکومت کی جائے۔

۵۔ دنیا کے بارے میں علم تجربات سے حاصل ہوگا مذہبی عقائد سے نہیں۔ [۱]

یورپ میں احیائے علوم اور اصلاحِ مذہب کی تحریکوں کے ظہور اور ان کے نتائج کے بارے میں اقبال کے ردِ عمل کا احوال بیان کرنے کے بعد اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ روشن خیالی کی تحریک پر وہ کیا رویّہ اختیار کرتے ہیں تاہم اس سوال کا جواب حاصل کرنے سے پہلے مغربی تہذیب وثقافت کے متعلق اقبال کے مجموعی رویے کی وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ راقم کے نزدیک اقبال مغربی تہذیب کے بارے میں مجموعی طور پر اعتدال پسندی کا رویہ اختیار کرتے ہیں جس کے مطابق وہ اُس کی خوبیوں کو اپنانے اور خرابیوں سے بچنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال جس طرح مسلمانوں کو یورپ میں فروغ پانے والے علوم وفنون کو حاصل کرنے اور وہاں کی تہذیب وثقافت کی ظاہری آب وتاب سے بچنے کا مشورہ دیتے ہیں اُسی طرح وہ اگر ایک طرف اسلامی دنیا میں روشن خیالی کے فروغ کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں تو دوسری جانب اس میں پوشیدہ خطروں سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا بھی اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی فرض کی بجا آوری میں اقبال روشن خیالی میں پوشیدہ خطروں کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے خطبے ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں فرماتے ہیں:

'بہر حال اُس تحریک کا جو حریت اور آزادی کے نام پر عالم اسلام میں پھیل رہی ہے ہم دل سے خیر مقدم کرتے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ آزاد خیالی کی یہی تحریک اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے۔ آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ اور انتشار کی طرف ہوتا ہے۔ لہٰذا نسلیت اور قومیت کے یہی

[۱] ڈاکٹر مبارک علی، یورپ کا عروج، ص: ۱۳۰

تصورات جو اس وقت دنیائے اسلام میں کارفرما ہیں اُس وسیع مطمحِ نظر کی نفی بھی کر سکتے ہیں جس کی اسلام نے مسلمانوں کو تلقین کی ہے۔'(۱)

انتشار انگیزی کے علاوہ اقبال کے نزدیک روشن خیالی کی تحریک میں ایک خطرہ اور بھی پوشیدہ ہے جسے وہ مذہب بیزاری کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے ایک خط مورخہ ۱۹ جنوری ۱۹۲۲ء میں اس خطرے کی نشاندہی کرتے ہوئے شیخ اعجاز احمد کے نام بجا طور پر لکھتے ہیں:

'اس وقت بالعموم انہی مسلمانوں کو ملازمت کے لیے پسند کیا جاتا ہے (خاص کر اعلیٰ ملازمتوں کے لیے) جن کی اسلامیت حکومت کے خیال میں کمزور ہو اور اس کمزوری کا نام وسعت خیال یا لبرل ازم رکھا جاتا ہے'۔(۲)

احیائے علوم، اصلاحِ مذہب اور روشن خیالی کی تحریکوں کے علاوہ صنعتی انقلاب کے ثمرات نے بھی سرزمین یورپ میں سیکولر نظام حیات کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ احیائے علوم اور روشن خیالی کی بدولت جیسا کہ ہم پہلے دیکھ آئے ہیں قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے لوگوں میں نہ صرف نئے نئے علوم کو حاصل کرنے کی تحریک پیدا ہوئی بلکہ اُن کے دلوں میں مشاہداتی منہاج کی مدد سے تسخیر فطرت کا جذبہ بھی بیدار ہوا جس کے نتیجہ میں وہاں نت نئے سائنسی علوم کا ظہور علم میں آیا چنانچہ یہی وہ سائنسی علوم ہیں جن کی بنیاد پر یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہوا اور وہاں بڑے پیمانے پر ترقی اور خوشحالی کا دور شروع ہوا۔ اب صاف ظاہر ہے کہ وہ معاشرہ جس میں مذہب لوگوں کی اجتماعی زندگی سے خارج ہو کر محض فرد کا ذاتی معاملہ بن چکا ہو اور جہاں لوگوں کو سوچنے اور اپنے فیصلے آپ کرنے کی آزادی حاصل ہو چکی ہو اور جہاں بے پناہ ترقی اور خوشحالی کی بدولت لوگوں کو کھل کر کھیلنے کے تمام مواقع میسر ہو چکے ہوں تو وہاں سیکولر نظام حیات کو فروغ حاصل نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا؟

قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں سیکولرازم کے ظہور، ارتقا اور عروج کے تاریخی پس منظر کا مطالعہ کرنے کے بعد اب ہمیں اِس سوال پر غور کرنا ہوگا کہ اگر زندگی کا یہ فلسفہ یورپ کی عیسائی دنیا میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے تو کیا یہ اسلامی دنیا میں بھی کامیاب ہو سکتا ہے اور کیا مسلمان

(۱) سید نذیر نیازی (مترجم)، تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص: ۲۵۱

(۲) سید مظفر حسین برنی (مرتب)، کلیاتِ مکاتیب اقبال، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص: ۳۱۶

معاشرے بھی اس پر عمل پیرا ہو کر وہی نتائج حاصل کر سکتے ہیں جو یورپین معاشروں نے حاصل کیے ہیں؟ راقم کے نزدیک اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے جس کی بنیادی وجہ عیسائیت اور اسلام کے تاریخی پس منظر کا وہ اختلاف ہے جس نے ابتدا ہی میں ان دونوں مذاہب کے سماجی رویوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔ عیسائیت کا ظہور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں یہود کی قانون پرستی کے خلاف ایک شدید ردِ عمل کے طور پر اُس وقت ہوا تھا جب رومیوں نے فلسطینی علاقوں پر نہ صرف قبضہ کر لیا تھا بلکہ وہاں اپنے قوانین بھی نافذ کر دیئے تھے۔ یہودیوں نے ان قوانین کی مخالفت کی جس کے نتیجہ میں وہاں کشت و خون بھی ہوا۔ چنانچہ اس تجربے کی روشنی میں حضرت عیسیٰؑ نے عدم تشدد کی پالیسی اختیار کی اور یہ کہہ کر ’’خدا کا حق خدا کے لیے اور سیزر کا حق سیزر کے لیے‘‘ ریاست کو مذہب سے جدا کر دیا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کی اس پالیسی کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال ناؤمن کے حوالے سے اپنے خطبے ’’الاجتہاد فی الاسلام‘‘ میں بجا طور پر لکھتے ہیں:

’ابتدائی مسیحیت نے ریاست، قانون، نظمِ امور پیداواری اور اس قسم کے دوسرے حقائق کو مطلق اہمیت نہیں دی۔ بالفاظ دیگر اُس نے انسانی معاشرے کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔‘[1]

اس کے برعکس اسلام اپنے ظہور کے وقت موجود سماجی حالات سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے انہیں تبدیل کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جزیرہ نمائے عرب میں سب سے پہلے کثرت پرستی کے خلاف جو اُس وقت معاشرے کی سب سے بڑی برائی تھی اپنی مہم کا آغاز کیا اور لوگوں کو خدائے واحد کی عبادت کرنے کی دعوت دی تھی جس نے عرب معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا۔ بہر حال ماہرین نفسیات کے خیال میں انسان کی سماجی زندگی اُس کے تصورِ خدا کا عکس ہوا کرتی ہے۔ اب چونکہ عربوں میں صدیوں سے کثرت پرستی کا رواج عام تھا اس لیے ان کے ہاں مرکزی قیادت کا فقدان تھا اور اُن کی سماجی زندگی مختلف شعبوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اسلام نے اس صورت حال کو بدلا اور وحدت پرستی کی بدولت نہ صرف انسانیت کو ایک پرچم تلے جمع کیا بلکہ زندگی کے تمام شعبوں یا پھر دوسرے الفاظ میں دین و دنیا کو یک جا بھی کر دیا اور یوں اسلام نے دین و دنیا کی وہ دوئی جسے عیسائیت نے رواج دیا تھا سرے سے مٹا دیا۔ چنانچہ عیسائیت اور اسلام کے اِس بنیادی فرق پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بجا طور پر فرمایا:

’اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی و سماوی اور آسمانی بادشاہت اور زمین کی خلافت دونوں کی

---

[1] سید نذیر نیازی (مترجم)، تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص: ۲۵۶

دعوت لے کر اوّل روز سے ہی پیدا ہوا۔ اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں ہیں۔ ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے جس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ۔ [۱]

اقبال کے نزدیک عیسائیت اور اسلام کے مابین زندگی کے بارے میں سماجی رویوں کا فرق دراصل دونوں مذاہب کی داخلی توانائی کا وہ فرق ہے جس کی بنیاد پر عیسائیت کو اپنے خارجی حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑا جب کہ اسلام اپنے خارجی حالات کو یکسر تبدیل کرنے پر کمر بستہ ہوگیا۔ اقبال کی رائے میں دنیا کے ان دونوں مذاہب کا بنیادی مقصد اگرچہ شرک اور بت پرستی کو ختم کرنا ہی تھا لیکن اپنی داخلی کمزوری کی وجہ سے عیسائیت کو بت پرستی سے مفاہمت اختیار کرنا پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال یورپ کی عیسائیت کو بھی جاہلیت قدیمہ کا ایک ناقص ترجمہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام نے کبھی شرک اور بت پرستی سے کمپرومائز نہیں کیا بلکہ اُسے ہر ممکن طریقے سے مٹانے کی کوشش کی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہر وہ شے یا خیال جو اسلام کی روح سے متصادم ہوتا ہے وہ اُسے ہرگز قبول نہیں کرسکتا۔ راقم کے نزدیک اب چونکہ شرک اور بت پرستی کی طرح سیکولرازم بھی اسلام کی روح سے براہِ راست متصادم ہوتا ہے اس لیے وہ اُسے بھی اپنے ہاں جگہ دینے کا روادار نہیں ہوسکتا۔ بہرحال شرک اور بت پرستی کے حوالے سے عیسائیت اور اسلام کا موازنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر نے جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی قابل غور ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتا ہے:

'اشاعت اسلام و اشاعت مسیحیت میں ایک بڑا اہم فرق ہے۔ مسیحیت کو کبھی بھی اتنی طاقت حاصل نہ ہوئی کہ دولت روما کی بت پرستی کا قلع قمع کرسکتی۔ جس قدر اس کو ترقی ہوئی اُسی قدر بت پرستی کا عنصر اس میں زیادہ ملتا گیا۔ لیکن عرب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قدیم بت پرستی کو ایسا مٹایا کہ اُس کا نشان تک باقی نہ رکھا۔ جن عقاید کی آپ کے جانشینوں نے تلقین کی اُن میں بت پرستی کا ڈھونڈنے سے بھی سراغ نہیں ملتا۔' [۲]

اقبال کی رائے میں علوم وفنون کی طرح دنیا میں مذاہب بھی دو قسموں کے پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو زندگی کو ہاں کہتے ہیں اور دوسرے وہ جو زندگی کو ناں کہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک

---

[۱] سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، المصباح ۱۶، اردو بازار، لاہور، ص: ۳۰

[۲] ظفر علی خان (مترجم)، معرکہ مذہب وسائنس، ص: ۱۸۳

اسلام کا تعلق پہلی قسم کے مذاہب سے ہے جب کہ عیسائیت کو وہ دوسری قسم کے مذاہب کی صف میں شمار کرتے ہیں۔ راقم کے خیال میں زندگی کو ہاں کہنے والے مذاہب سے اقبال کی مراد وہ مذہب ہوتے ہیں جن میں اگر ایک طرف فرد کا رشتہ خدا سے استوار کیا جاتا ہے تو دوسری جانب اجتماعی زندگی کے معاملات ومسائل کو حل کرنے کے احکام بھی بتائے جاتے ہیں جب کہ زندگی کو ناں کہنے والے مذاہب میں صرف اللہ اور بندے کے تعلق پر ہی زور دیا جاتا ہے اور اجتماعی زندگی کے معاملات ومسائل کے حل کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہم اسلام کو ایک مکمل نظام حیات قرار دے سکتے ہیں جس میں عبادات وعقائد کے ساتھ ساتھ معاملات کو بھی دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے اُسے کسی ''ازم'' کی ضرورت نہیں جب کہ عیسائیت میں ہمیں معاملات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ چنانچہ اقبال زندگی کو ناں یا ہاں کہنے کے حوالے سے اسلام اور عیسائیت کا باہمی فرق شعر کی زبان میں یوں بیان فرماتے ہیں ؎

کاروبارِ خسروی یا راہبی؟
کیا ہے آخر غایتِ دین نبی؟
مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ[۱]

راقم کے نزدیک اسلام ایک مکمل نظام حیات یا پھر دوسرے الفاظ میں دین ہے جس میں عقائد اور عبادات کے علاوہ معاملات کا عنصر بھی شامل ہے جب کہ عیسائیت صرف ایک مذہب ہے۔ اگر کسی قوم کے نظام حیات میں جسے اپنے آسمانی ہونے کا دعویٰ بھی ہو عقائد، عبادات اور معاملات کے تینوں عناصر یکجا موجود پائے جائیں تو ہم اُسے دین کا نام دیں گے لیکن اگر کسی نظام حیات میں صرف پہلے دو عناصر تو موجود ہوں اور معاملات کا تیسرا عنصر اُس میں مفقود ہو تو اُسے مذہب۔ سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس اصول کی روشنی میں اسلام ایک مکمل دین ہے اور عیسائیت ایک مذہب لیکن بنیادی سوال تو یہ ہے کہ از روئے اسلام معاملات سے کیا مراد لی جاتی ہے؟ چنانچہ اسلام کی رو سے معاملات کا اطلاق سماجیات، اقتصادیات، سیاسیات اور تہذیب وثقافت کے اُن تمام شعبوں پر ہوتا ہے جنہیں قرآنی تعلیمات کے مطابق چلانے کی ہدایت دی جاتی ہے۔ اب صاف ظاہر ہے کہ جس معاشرے میں رہنمائی کی یہ صورت ہو وہاں سیکولرازم جیسے انسانی فلسفے کی

---

[۱] علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال (اردو)، ص: ۴۳۱

ضرورت کیسے پڑ سکتی ہے؟ بہر حال سید سلیمان ندویؒ معاملات کے حوالے سے دنیا کے مختلف ادیان ومذاہب کی صف بندی کرتے ہوئے بجا طور پر فرماتے ہیں:

'دنیا کے مذاہب نے معاملات کو اپنی تعلیم کا حصہ بنانے میں مختلف رجحانات ظاہر کیے ہیں تورات میں وہ مذہبی قوانین کا ضروری اور اہم جزو ہیں لیکن عیسائیت نے اُن کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہندوستانی مذہبوں میں بھی دونوں قسمیں نظر آتی ہیں۔ عام ہندوؤں میں منوشاستر اور اُس کی مختلف تشریحات انہی معاملات کی شاخیں ہیں مگر شاید بودھ مت نے اخلاق ہی کو بڑھا کر قانون بنانے کی کوشش کی ہے تاہم یہ سب قومیں اپنے قانون کا ماخذ علم الٰہی علم مافوق انسانی کو قرار دیتی ہیں۔ (۱)

اب ذہن میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام دین کے اصولوں پر مبنی ایک مکمل نظام حیات ہے جو انسان کی روحانی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اُن کی دنیاوی حاجات بھی پوری کر سکتا ہے تو پھر مسلمانوں کی موجودہ تمدنی حالت اور دیگر زمینی حقائق اُس کے اِس دعوے کی شہادت کیوں نہیں دیتے؟ راقم کے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں میں جب تک خلافت کا ادارہ قائم رہا اُس وقت تک ہمیں دین و دنیا کی مکمل ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے جو اُن کی ترقی اور خوشحالی کی ضامن تھی لیکن ملوکیت کے سر اٹھاتے ہی ان دونوں میں جدائی کا عمل شروع ہو گیا جس میں وقت کے ساتھ ساتھ بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا اور یوں مسلمان بھی اُسی فرض کا شکار ہو کر رہ گئے جس کا اُن سے پہلے عیسائی ہو چکے تھے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں میں دین و دنیا کی جدائی کا یہ عمل اُس وقت اور بھی تیز ہو جاتا ہے جب کہ مغربی اقوام نے مسلم ممالک پر نہ صرف زبردستی قبضہ جما لیا بلکہ اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کی خاطر اُن کی تعلیمی اور عدالتی نظام کو تبدیل کر کے اُس کی جگہ اپنے نصاب اور قوانین نافذ کر دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام جو کبھی اپنے علاقوں میں دین کی صورت میں نافذ ہوا کرتا تھا غلامی میں ایک مذہب بن کر رہ گیا۔

اقبال کے نزدیک اسلام چونکہ بجائے خود ایک تقدیر ہے، جسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا اس لیے وہ صرف آزاد ماحول ہی میں اپنی توانائیوں کا فطری اظہار کر سکتا ہے جس کے پیش نظر انہوں نے برصغیر پاک و ہند میں ایک اسلامی ریاست کے حصول کا خواب

(۱) سید سلیمان ندوی، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص:۱۱

دیکھا جس میں اسلامی نظامِ حیات کو نافذ کرنا اس کا بنیادی مقصد قرار دیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے نہ صرف اس مقصد سے مکمل طور پر اتفاق کیا بلکہ اُس کے حصول کا بیڑا بھی اٹھایا جس میں وہ ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کو کامیابی سے ہم کنار بھی ہوئے مگر آج ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ ملک جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اُس میں روشن خیالی کے نام پر سیکولرازم کو مسلط کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں اور اُس کے لیے دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ سیکولر اصولوں پر چل کر ہی پاکستان کو ایک روشن خیال، ترقی یافتہ اور خوشحال ملک بنایا جا سکتا ہے۔ راقم کے نزدیک پاکستان میں اِس قسم کی باتیں کرنا نہ صرف اقبال اور قائداعظم کے تاریخی مؤقف سے انحراف ہے بلکہ یہ اس بات کا برملا اظہار بھی ہے کہ اسلام گویا موجودہ عہد کے مسائل کو حل کرنے کا اہل نہیں۔ چنانچہ سید سبط حسن پاکستان میں سیکولر نظام کے نفاذ کی وکالت کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں لکھتے ہیں:

’سیکولرازم سے اسلام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے اور نہ اس سے پاکستان کی بقا و سالمیت پر کوئی ضرب پڑتی ہے بلکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ سیکولر اصولوں ہی پر چل کر پاکستان ایک روشن خیال، ترقی یافتہ اور خوش حال ملک بن سکتا ہے۔‘[۱]

راقم کے خیال میں سید سبط حسن کا یہ خیال درست نہیں ہے اور اُسے اُن کی اس رائے سے بھی سخت اختلاف ہے کہ سیکولرازم کو معاشرتی نظام کے لیے درست سمجھنے سے دین دار بے دین اور خدا پرست دہریہ نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ راقم کے نزدیک سیکولرازم اور اسلام نہ صرف دو جداگانہ نظام ہائے حیات کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ ان دونوں کے اصولوں میں بھی بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ سیکولرازم مابعد الطبیعیات کے انکار پر مبنی وہ نظامِ حیات ہے جو صرف اسی دنیا اور اسی زمانے کی بات کرتا ہے جب کہ اس کے برعکس اسلام مابعد الطبیعیات کو نہ صرف اپنا ماخذ و مصدر قرار دیتا ہے بلکہ وہ اس دنیا کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی بات بھی کرتا ہے جسے وہ آخرت کا نام دیتا ہے۔ اس لیے جب کوئی فرد اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ بیک وقت مسلمان بھی ہے اور سیکولر بھی تو اُس کا یہ دعویٰ محلِ نظر دکھائی دیتا ہے کیونکہ ایسا فرد یا تو انتہائی سادہ لوحی کا شکار ہے جسے نہ اسلام کا پتا ہے نہ سیکولرازم کا یا پھر وہ گہرا سازشی ذہن رکھنے والا انسان جو اپنی مسلمانی کی آڑ میں پاکستان کی نظریاتی جڑیں کھوکھلی کرنا چاہتا ہے۔ ایسے ہی سازشی انسانوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مولانا سید

[۱] سید سبط حسن، نوید فکر، ص: ۱۷

ابوالحسن علی ندویؒ کیا خوب لکھتے ہیں:

'روشن خیالوں کے منہ میں دو زبانیں ہوتی ہیں ایک دوسروں سے گفتگو کے لیے اور ایک اپنوں سے بات چیت کرنے کے لیے، اور سیکولرازم بلکہ الحاد و مذہب دشمنی کی ساری تبلیغ بھولے بھالے اسلامی ممالک کے لیے ہے جنہوں نے نئی نئی آزادی حاصل کی ہے۔[۱]

اس وقت پاکستان بھی ایسا ہی سازشی ذہن رکھنے والے روشن خیال دانشوروں کی زد میں ہے جو اس کا مقدرِ اسلام کے ساتھ جوڑنے کی بجائے سیکولرازم کے ساتھ جوڑنے کے آرزومند ہیں اور انہوں نے اس مقصد کے حصول کی خاطر تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی مہم بھی شروع کر رکھی ہے جس کی ایک مثال تحریک پاکستان اور اُس کے مرکزی رہنما قائداعظم محمد علی جناح کو سیکولر قرار دینا ہے۔[۲] راقم کے نزدیک تحریک پاکستان اور قائداعظم محمد علی جناح کو سیکولر قرار دینا دراصل تاریخی حقائق کو مسخ کرنا ہی تو ہے جس کی تردید کرنے کے لیے اگرچہ تاریخ کے اوراق میں ہزاروں شواہد موجود ہیں تاہم اس مقصد کے لیے اگر اقبال اور قائداعظم کے درمیان ہونے والی خط و کتابت کا مطالعہ کرلیا جائے گا تو کافی ہوگا۔ مثال کے طور پر اقبال قائداعظم محمد علی جناح کے نام پر اپنے ایک خط محررہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء میں وہ ایک آزاد مسلم ریاست کا قیام صرف اس لیے چاہتے ہیں کہ اُس میں شریعت اسلامیہ کا نفاذ ممکن بنایا جاسکے جس کی بدولت اگر ایک طرف مسلمانوں کے معاشی مسائل حل کرنے میں مدد ملے تو دوسری جانب اُن کی تہذیب وثقافت کی حفاظت کو بھی ممکن بنایا جائے۔ بہر حال پاکستان میں سیکولر دانشوروں کی سرگرمیوں سے باخبر کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال روزنامہ جنگ کو دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

'اسی طرح قائداعظم کے بارے میں متنازعہ چند سوالات اور باتیں پھیلائی جاتی رہی ہیں اُن کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ وہ سیکولر ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسلامی ریاست کے قیام کے حق میں نہیں تھے.... اس طرح یہ ادارے اور شخصیات ایک منظم سازش کے تحت پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانے کے لیے کوشاں ہیں'۔[۳] (بشکریہ 'اقبالیات')

(جاری ہے)

---

[۱] ابوالحسن ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، ۱۹۷۶ء، ص: ۲۰۶

[۲] سید سبط حسن، نوید فکر، ص: ۱۵۸، ۱۶۱

[۳] ڈاکٹر وحید عشرت (مرتب)، اقبال ۸۵، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص: ۴۶۸

فہم دین

ڈاکٹر محمد امین

کرپشن کی شرعی حیثیت

شرعی تناظر میں کرپشن کے موضوع پر غور کرنے سے اس کے تین پہلو سامنے آتے ہیں:

ایک: جس چیز کو جدید اصطلاح میں کرپشن کہتے ہیں، شریعت میں اس کا اطلاق حرام اور باطل طریقے سے مال کمانے کے سارے طریقوں پر ہوتا ہے جو سب گناہ کبیرہ ہیں جیسے چوری، ڈاکا، دھوکہ دہی، خیانت، سود کھانا اور رشوت لینا وغیرہ۔ ان کی شناعت اور گناہ ہونا شریعت نے خوب واضح کر دیا ہے جیسے سود کھا، خیانت اور سود اللہ ورسول سے جنگ ہے[۱]۔ اور حدیث میں ماں سے زنا کرنے کے برابر ہے[۲]۔ سود اور یتیموں کا مال کھانا آگ سے پیٹ بھرنے کے مترادف ہے[۳]۔ قرآن نے رشوت خوری کی مذمت کی ہے[۴] اور حدیث میں حرام کمانے والے کے بارے میں کہا گیا کہ اس کی نماز اور دعا قبول نہیں ہوتی[۵] اور وہ جنت میں نہیں جائے گا[۶]۔ نیز ان شنیع اور قبیح کاموں پر اللہ تعالیٰ نے سخت سزائیں دنیا ہی میں مقرر کیں جیسے چور کے ہاتھ کاٹے جائیں[۷] اور ڈاکوؤں کے ہاتھ اور پیر دونوں کاٹے جائیں[۸]۔ اور حدیث میں ہے کہ ایسے لوگوں کی گواہی قبول نہ کی جائے[۹] اور اصل سزا تو آخرت میں ناکامی، رسوائی، آگ کے عذاب اور اللہ کی ناراضی کی صورت میں ملے گی۔ (اللہ ہمیں اور سب مسلمانوں کو اس سے بچائے، آمین)

---

[۱] البقرہ۲:۲۷۹

[۲] سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، حدیث نمبر ۲۲۷۴۔ المستدرک للحاکم، حدیث نمبر: ۲۲۵۹

[۳] النساء۴:۱۰

[۴] البقرہ۲:۱۸۸

[۵] صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۰۱۵

[۶] رواہ ابوداؤد

[۷] المائدہ۵:۳۸

[۸] المائدہ۵:۳۳

[۹] سنن ابی داؤد، کتاب القضاء

دوم: ان شنیع اور قبیح معاشی جرائم کی شرعی سزا دینا میں دینا اسلامی ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے لیکن جرم کی سزا دینے سے پہلے اس کا اہتمام اشد ضروری ہے کہ لوگوں کی ایسی تعلیم وتربیت کی جائے کہ وہ اچھے مسلمان بنیں اور ان کی عمدہ اخلاقی تربیت ہو تا کہ وہ رذائل اخلاق کو اپنائیں ہی نہیں جب کہ ہمارا نظام تعلیم وتربیت مغرب زدہ ہے اور اسلام کی بجائے سیکولرزم، لبرل ازم اور دیگر مغربی اقدار کو معاشرے میں فروغ دے رہا ہے۔ اسی طرح ہمارا میڈیا مغرب کی پیروی کر رہا اور رقص وسرود، فحاشی وعریانی اور مغربی اقدار کو پھیلا کر لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کر رہا اور انہیں دین سے دور کر رہا ہے۔ حکومت، دینی عناصر اور عوام سب کا فرض ہے کہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے جدوجہد کریں۔

سوم: دستور پاکستان کی دفعہ ۶۲، ۶۳ عوامی نمائندگی کی اہلیت کے لیے صادق وامین ہونا ضروری قرار دیتی ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اس دفعہ میں ترمیم کر کے اسے زندگی کے سارے شعبوں میں نافذ کیا جائے جیسے سول بیوروکریسی، فوج، عدلیہ، پولیس وغیرہ۔ اور اس کے دو اجزا ہونے چاہئیں: ایک یہ کہ کوئی آدمی ان شعبوں میں ملازمت/ نمائندگی حاصل نہ کر سکے اگر وہ صاف ستھرے اخلاق کا حامل نہ ہو (یعنی صادق اور امین نہ ہو)۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی مرحلے پر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ صادق اور امین نہیں ہے تو اسے ملازمت/ نمائندگی سے نکال باہر کیا جائے تا کہ معاشرہ اس کے ضرر سے بچ سکے۔ جو لوگ ان دفعات کو دستور سے نکالنا چاہتے ہیں تا کہ انہیں کرپشن کی کھلی چھٹی ملی رہے ان کا راستہ روکنا بھی ضروری ہے۔

محسنؔ ہمارے ساتھ بڑا حادثہ ہوا
ہم رہ گئے، ہمارا زمانہ چلا گیا

پاکستانیات مدیر

یہ اخلاقی پستی کی انتہاء ہے

ملک کی دونوں بڑی سیاسی جماعتیں نہ صرف کرپٹ ہیں بلکہ وہ کرپشن کرنے پر مصر ہیں

سابق وزیر اعظم میاں نواز شریف صاحب کو ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے پانچ سینئر ججوں نے متفقہ طور پر کرپٹ قرار دیا اور انہیں وزارتِ عظمیٰ کے لیے نا اہل قرار دیا۔ اب ان پر کرپشن کے مقدمات چلیں گے۔ ان کے مقرر کردہ نئے وزیر اعظم صاحب نے اعلان کیا ہے کہ وہ آئین کی دفعہ ۶۳، ۶۲ کو آئین سے خارج کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے بلاول زرداری صاحب نے ۶۳، ۶۲ کے اخراج کے حوالے سے ان کی حمایت کا اعلان کیا ہے۔ دونوں بڑی پارٹیاں اور ان کے حلیف مل جائیں تو ان کو ایوان میں اتنی اکثریت حاصل ہو جائے گی کہ وہ یہ آئینی ترمیمی منظور کرا سکیں۔

لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟ آئین سے دفعہ ۶۳، ۶۲ کے اخراج کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں بڑی سیاسی جماعتیں چاہتی ہیں کہ ان کے قائدین پر صادق اور امین ہونے کی پابندی نہ ہو۔ مطلب یہ کہ ان کے کرپٹ ہونے پر اعتراض نہ کیا جائے بلکہ انہیں کرپشن کرنے دی جائے۔ یہ ڈھٹائی، بے دینی اور اخلاقی پستی کی انتہاء ہے۔ مغرب کی لادین اور سیکولر جمہوریت میں بھی سیاسی قیادت کا کچھ اخلاقی معیار ہوتا ہے لیکن ایک مسلم معاشرے میں تو اس طرح کی اخلاقی پستی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

❁ جس چیز کو جدید اصطلاح میں کرپشن کہا جاتا ہے، شرعی اصطلاح میں اسے مال حرام، رشوت، فراڈ، دھوکہ بازی، چوری، ڈاکہ اور باطل طریقے سے مال کمانا کہتے ہیں۔ یہ سارے کام اللہ تعالیٰ کی معصیت اور گناہ ہیں اور ان کی مذمت کے بارے میں شرعی احکام اور سزائیں معروف و مشہور ہیں۔

اور حدیث کی رو سے ایسے شخص کی گواہی قابل قبول نہیں ہوتی۔ گویا وہ مسلم معاشرے کا معزز اور باوقار شہری نہیں ہوتا کجا یہ کہ معاشرے کی قیادت اسے سونپ دی جائے۔ ایسا شخص،

عدالت سے جرم ثابت ہونے کے بعد، مذکورہ بالا شدید سزاؤں کا مستحق ہے نہ کہ مسلم معاشرے میں لیڈری کرنے کا۔

لیکن یہ تو اسلامی احکام ہیں؟ اور اسلامی احکام کو آج کل کون پوچھتا ہے؟ آج کل کی جدید ریاست تو مغرب کے لادین سیکولر جمہوری نظام کے تحت چلتی ہے جس میں عوام کے نمائندے جس حرام کو چاہیں حلال قرار دے سکتے ہیں۔

❁ اگر کسی مسلمان سے گناہ سرزد ہو جائے تو توبہ کی طرف پہلا قدم یہ ہوتا ہے کہ آدمی اللہ کے سامنے ندامت کا اظہار کرے اور پھر اس گناہ کو دوبارہ نہ کرنے کا عزم کرے لیکن میاں نواز شریف صاحب کرپشن کا جرم ثابت ہونے پر ذرا بھر بھی نادم نہیں ہوئے کہ ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے پانچ سینئر ججوں نے بالاتفاق انہیں کرپشن کا مرتکب قرار دیا ہے بلکہ وہ ڈھیٹ بن کر کہتے ہیں کہ میں نے کوئی کرپشن نہیں کی۔ وہ عدالت کا فیصلہ ماننے کو تیار نہیں اور اپنے سیاسی متبعین کی مدد سے اس فیصلے کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔

❁ اے پاکستان کے لوگو! سوچو کہ ہماری قیادت کرپٹ کیوں ہے؟ میاں صاحب کی کرپشن تو عدالت میں ثابت ہوگئی۔ زرداری صاحب کرپشن کے بادشاہ تھے۔ مشرف صاحب کی کرپشن زبان زد عام ہے۔ بیوروکریسی، فوج اور عدلیہ میں کرپشن کی باتیں عام ہیں۔ پولیس، محکمہ مال، نچلی عدالتیں بلکہ حکومت کے سارے محکمے اور زندگی کے ہر شعبے میں کرپشن عام ہے۔ ہم سب یا چلیے یوں کہہ لیتے ہیں کہ ہماری اکثریت کرپٹ ہے.... کیا کبھی ہم نے سوچا کہ ہم کرپٹ قوم کیوں بن گئے ہیں؟ کرپشن ہمارے معاشرے میں کیوں نیچے سے اوپر تک پھیلی ہوئی ہے؟ کبھی ہم نے سوچا کہ ہم قوم کی اور اس کے نونہالوں کی اسلامی تربیت کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ ہمارا نظام تعلیم اور اس تعلیم کا نظام تربیت کیا ہمیں اچھا مسلمان بنا رہا ہے؟ خدا کے لیے سوچو! ہم سب اگر مغرب زدہ نظام تعلیم و تربیت اور مغرب کے پیرو میڈیا کے ذریعے اپنے بچوں کی صحیح تربیت نہیں کر رہے تو مجرم تو ہم خود ہیں۔

۱۴؍اگست: جشن؟.... مگر کس بات کا؟

❁ ۱۴؍اگست کو پاکستانی قوم نے آزادی کا جشن منایا جس میں دیگر باتوں کے علاوہ لوگوں نے آدھی رات کو ہوائی فائرنگ کی، سڑکوں پر ادھم مچایا، سیٹیاں بجائیں، ہلّہ گلا کیا، ون ویلنگ کی،

شرابیں پیں اور ڈانس کیے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

❁ اسلام کی روایت میں مسلمان خوشی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ اللہ کے حضور سجدۂ شکر بجا لاتے ہیں۔ اگر ہمیں وہ کرنا ہوتا تو ہم یوم پاکستان ۱۴/اگست کی بجائے ۲۷ رمضان المبارک کو مناتے لیکن ہمیں خوشی منانے اور شکر ادا کرنے کا یہ اسلوب کب یاد ہے؟

❁ پھر جشن کس بات کا؟ کیا ہم نے نئی نسل کو بتایا ہے کہ ہم نے پاکستان کیوں حاصل کیا تھا؟ ہماری سیاسی قیادت نے یہ مملکت خداداد اپنے خالق اور اس کی مخلوق سے اس وعدے کے ساتھ بنائی تھی کہ اسے اسلام کا قلعہ بنایا جائے گا اور یہاں ہر سطح پر اسلام کی تعلیمات پر عمل کیا جائے گا لیکن ہماری سیاسی قیادت نے غداری کی اور خالق اور اس کی مخلوق کے ساتھ کیے گئے وعدے کو توڑا بلکہ اب تو ان اصولوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور ان کی جگہ سیکولرازم، لبرل ازم اور مغرب کے دوسرے نظریات واقدار نے لے لی ہے۔

❁ ہم ۱۴/اگست کی مبارکباد کس کو دیں اور کیسے دیں؟ ہم نے خدا کی غلامی سے جان چھڑائی تو شیطان نے ہمیں امریکہ کی غلامی میں دے دیا اور ہمیں ہمارے نفس کے حوالے کر دیا۔ علماء نے دینی سیاسی جماعتیں بنا کر اس قیادت کا ہاتھ پکڑنے یا خود کو متبادل قیادت کے طور پر سامنے لانے کی بجائے ایسی پالیسیاں اختیار کیں کہ وہ ناکام ہو گئیں اور اب بڑی سیکولر سیاسی جماعتوں کی طفیلی بن کر زندہ ہیں۔ دینی مدارس، مساجد اور اصلاحی جماعتیں اپنے محدود تصور دین میں غلطاں ہیں اور پاکستان کا اسلامی معاشرہ دینی لحاظ سے ناکامی اور تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ کہاں کا اسلامی انقلاب اور کہاں کا غلبۂ دین؟ لیکن ہمیں نہ اس کا شعور ہے اور نہ اس کی پروا۔

یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں

❁ کرپشن کے جرم میں سپریم کورٹ کی طرف سے نااہلی کے بعد میاں نواز شریف نے سیاسی اچھل کود کے درمیان جو باتیں کہی ہیں وہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سازش ہوئی ہے۔ اگرچہ خود انہوں نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا لیکن ان کے حواری کہتے ہیں کہ بیرونی سازش ہے۔ ممکن ہے امریکہ نے سازش کی ہو لیکن جب آپ اقتدار میں تھے اور آپ کے خلاف سازش ہو رہی تھی تو آپ کو اس کے توڑ کے لیے قوم اور عوام کے پاس جانا چاہیے تھا لیکن آپ کی ہمت کا تو یہ عالم ہے کہ آپ کا اقتدار جاتا رہا لیکن آپ نے ابھی تک قوم کو یہ نہیں بتایا کہ آپ کے

خلاف سازش کس نے کی ہے؟

❁ دوسری بات وہ یہ کرتے ہیں کہ ادارے میرے خلاف ہو گئے ہیں ۔ ظاہر ہے یہ ادارے دو ہی ہیں ایک عدلیہ اور دوسرے فوج ۔ جہاں تک عدلیہ کا تعلق ہے لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ عدلیہ احتساب کی پالیسی نہیں بناتی ، نہ وہ اپنی مرضی سے کسی کے خلاف کرپشن کا کیس چلاسکتی ہے ۔ اس کے پاس تو جو کیس آ جائے وہ اس کا میرٹ پر ، موجود قانون کے تحت فیصلہ کرتی ہے ۔ اس کے پاس کیس آیا کہ میاں نواز شریف اور اس کے خاندان نے بیرون ملک کمپنیاں اور جائدادیں بنائی ہیں جن کا ذکر ان کے ملکی اداروں کو فراہم کردہ اثاثوں میں نہیں ہے لہٰذا وہ دیانت دار نہیں ، انہیں نااہل قرار دیا جائے ۔ عدالت نے اس پر میرٹ کے مطابق فیصلہ دے دیا ۔ عدالت کے سامنے یہ کیس نہیں آیا کہ میاں نواز شریف نے جائدادیں کیسے بنائی ہیں؟ کمیشن سے یا کِک بیکس سے یا رشوت سے؟ لہٰذا عدالت نے اس بات کو نہیں چھیڑا ۔ عدالت کے پاس اس زور شور سے زرداری ، مشرف یا کسی دوسرے بیورکریٹ ، جرنیل یا جج کی کرپشن کا کیس نہیں آیا لہٰذا وہ انہیں کیسے سن سکتی ہے؟ یہ میاں صاحب کی حکومت کی ذمہ داری تھی کہ وہ کرپشن کیسز سپریم کورٹ کو بھجواتی لیکن اس نے کبھی ایسا نہیں کیا ۔

❁ جہاں تک فوج کا تعلق ہے ، میاں نواز شریف کی بات میں وزن ہو سکتا ہے کیونکہ ہمارے ہاں بدقسمتی سے شروع سے سول اور فوج میں اختیارات پر قبضے کا اور اس بات میں مقابلہ رہا ہے کہ امریکہ کی بات زیادہ کون مانتا ہے؟ اور فوج اس معاملے میں سول پر ہمیشہ بازی لے جاتی رہی ہے مثلاً ابھی ہمارے سامنے کی بات ہے کہ میاں نواز شریف کی سول حکومت پاکستانی طالبان کو مرکزی سیاسی مذہبی دھارے میں لانے کے لیے کوشاں تھی کہ ان میں امریکی و بھارتی ایجنٹوں نے دہشت گردی نہ روکی اور جنرل راحیل نے سیاسی حکومت سے پوچھے بغیر وزیرستان میں آپریشن شروع کر دیا ۔ اسی طرح امریکہ اور بھارت نے پشاور سکول پر سفاکانہ دہشت گرد حملہ کرایا اور دہشت گردی سے نمٹنے کے نام پر سول اور دینی قوتوں کے خلاف فوج کو وسیع تر اختیارات دے دیے گئے .... لیکن ہماری نگاہ میں اس کی ذمہ داری بھی نواز شریف پر عائد ہوتی ہے کیونکہ آ گر انہیں فوج کی بالادستی پر اعتراض تھا اور وہ حکمران تھے تو سیاسی جماعتوں کو اعتماد میں لیتے اور ان کی اے پی سی بلاتے ۔ ساری اسمبلیوں کو اکٹھا کرتے ، عوام کے پاس جاتے ۔ غرض اقتدار میں

رہتے ہوئے وہ اس مسئلے سے بخوبی نمٹ سکتے تھے لیکن جب تک وہ اقتدار میں تھے وہ خاموش رہے اور اب بھی صرف اشاروں کنایوں میں بات کرتے ہیں۔ کھل کر بات کرنے کی ان میں اب بھی ہمت نہیں تو انہیں گلہ کس سے ہے؟ بلکہ اب بھی مرکز اور پنجاب میں ان کی جماعت کی حکومت ہے اور حلیفوں کے علاوہ پیپلز پارٹی کی حمایت بھی اس معاملے میں ان کو مل سکتی ہے اور فوج کی سیاسی بالادستی کے خلاف سیاسی عناصر اکٹھے ہو سکتے ہیں لیکن ن لیگ کی حکومت کچھ نہیں کر رہی۔

سپریم کورٹ کی طرف سے متفقہ طور پر کرپشن کا جرم ثابت ہو جانے اور نا اہل ہو جانے کے بعد اب نواز شریف کا سازش کا ذکر کرنا یا اداروں کا ان کے خلاف ہونے کا واویلا کرنا بے سود ہے کیونکہ اب تو ہر کوئی اسے کرپشن کی سزا سے جان چھڑانے کی کوشش ہی قرار دے گا۔

۞ میاں صاحب کی اس بات میں وزن ہے کہ دوسرے کرپٹ لوگوں کا احتساب کیوں نہیں ہوا، صرف ان کا کیوں ہوا ہے؟ لیکن اس کے ذمہ دار بھی وہ خود ہیں۔ کیا وہ زرداری، مشرف اور دوسرے کرپٹ لوگوں کے مضبوط کیس بنا کر سپریم کورٹ میں لے کر گئے تھے؟ اگر نہیں لے کر گئے تو وہ خود قصور وار ہیں۔

۞ میاں صاحب سے انقلاب اور اینٹی اسٹیبلشمنٹ کے نعرے سن کر ہنسی آتی ہے۔ اس منہ سے تو مسور کی دال کے ریٹ ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مفاد پرست سیاستدان جن کا ایک ہی نظریہ ہے حبّ جاہ اور حبّ مال اور اس کے لیے وہ نفاذ شریعت ترک کرنے، امریکہ کی غلامی کرنے اور مغربی فکر و تہذیب کو اپنے ملک پر مسلط کرنے کے لیے تیار ہیں، خواہ وہ فوجی حکمران ہوں یا سول۔ ہاں! جس امر کا خدشہ ہے وہ یہ کہ میاں صاحب پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر آئین اور قوانین سے اسلامی دفعات نکال سکتے ہیں تاکہ دونوں کو کرپشن کی کھلی چھٹی ملی رہے۔ اور ہماری بدقسمتی دیکھیے کہ اس ملک میں اسلامی قوتیں اتنی کمزور ہیں کہ اگر زرداری اور نواز شریف دفعہ ۶۲، ۶۳ آئین سے نکالنے پر تل جائیں تو یہ ان کا ہاتھ نہیں روک سکتیں۔ نہ ان کے پاس ووٹ کی قوت ہے اور نہ سٹریٹ پاور کیونکہ انہیں مسلک عزیز ہے، دین نہیں۔ وہ متحد نہیں کیونکہ یہ شریعت کے تحفظ پر متفق نہیں، کیونکہ یہ غلبۂ دین پر متفق نہیں.... یہ صرف ایک بات پر متفق ہیں کہ کسی طرح وزارت مل جائے۔ جس کو مرکز میں مل جائے وہ بھی خوش اور جس کو صوبے میں مل جائے وہ بھی خوش۔ لعنت ہو اس مغرب زدہ سیاست پر۔

پاکستانیت ‘نقیبِ سحر’

میرا دُکھ کچھ اَور ہے

میرا دکھ یہ نہیں کہ وزیراعظم محمد نواز شریف کو نا اہل قرار دے دیا گیا بلکہ میرا دُکھ تو یہ ہے کہ اس واقعہ پر لوگوں نے جو رویہ اختیار کیا، جو کمنٹس دیے اور جس طرح خوشی یا ناراضی کا اظہار کیا، وہ اخلاقِ عالیہ اور وقارِ انسانیت کا موزوں اظہار نہیں تھا۔

میں اس لیے کرب میں مبتلا نہیں ہوں کہ نواز شریف کو نا اہل کیوں قرار دیا گیا۔ شاید مشیت الٰہی بھی یہی تھی اور شاید حقائق کا تقاضا بھی یہی ہو گا لیکن میرا کرب تو یہ ہے کہ عزت مآب جج صاحبان کوئی مضبوط بنیاد ہی تلاش کر لیتے۔ اتنی بودی، کمزور اور نا قابل تسلیم بنیاد پر ملک کے وزیر اعظم کو نا اہل قرار دینا حکومت، ریاست اور معاشرے کو عدم استحکام اور جذباتیت کا شکار کر دینا کوئی عادلانہ اور دانش مندی کا اقدام نہیں تھا۔

عزت مآب جج صاحبان تو اپنے فیصلوں میں بولتے ہیں۔ جج کا کام فیصلہ کرنا ہے طعن و تشنیع کرنا نہیں۔ طعن و تشنیع سے آلودہ کمنٹس تو جج کو تعصب اور جانبداری کا شکار کر دیتے ہیں۔ مجھے دکھ ہوا جب ایک معزز جج نے گاڈ فادر کی اصطلاح استعمال کی اور حکومت کو سسلین مافیا کا طعنہ دیا۔ مانا کہ جج بھی انسان ہوتے ہیں اور ان کے ضمیر میں بھی موافقت اور مخالفت کے جراثیم ہو سکتے ہیں لیکن یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ جج صاحبان انسان ہوتے ہوئے جج ہوتے ہیں۔ اور یہ انسانیت میں ایک اعلیٰ وارفع درجہ ہے۔ کاش وزیر اعظم کو نا اہل قرار دینے والے جج صاحبان اس اعلیٰ وارفع مقام پر ہی قائم رہتے۔

میں پھر کہوں گا کہ میرا دکھ نواز شریف کی نا اہلی نہیں بلکہ میرا دکھ تو یہ ہے کہ اس عمل میں میرے کچھ محترم اداروں کی طرف سے جانبداری کا تاثر اُبھرا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ تاثر حقیقت کو گہنا دیتا ہے۔ میری بھی اور ہر پاکستانی کی یہ جائز بلکہ پُر خلوص خواہش ہے کہ ہماری عدالتیں اور ہمارے محافظ ادارے غیر جانبدار رہوں اور ہمیں عدل مہیا کرنے میں اور اللہ کی مرضی کے تحت ہمیں حفاظت کی چھتری عطا کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے رہیں۔ تمام تر انسانی کمزوریوں کے باوجود

ہم اپنی پولیس، اپنے سول مسلح اداروں اور اپنی بہادر فوج کے جانباز جوانوں اور کمانڈروں کی دل و جان سے عزت کرتے ہیں، انہیں سلام کرتے ہیں اور اللہ رب العزت سے اُن کی سلامتی وترقی کی دعا کرتے ہیں۔ وہ ہمارے بیٹے ہیں، بھائی ہیں اور ہمارا خون ہیں۔

میں ایک دفعہ پھر اعادہ کرتا ہوں کہ میرا دُکھ نواز شریف کی نااہلی نہیں بلکہ میرا دکھ تو وہ ماحول، وہ بیانیہ اور وہ رویہ ہے جو نواز شریف کے مخالفوں اور اس کے حمایتیوں نے پچھلے کئی ماہ سے اختیار کر رکھا تھا۔ میرا شکوہ تمام ٹی وی چینلوں سے ہے جنہوں نے ایسے رویوں اور ایسے بیانیوں کی اخلاقی گندگی پھیلانے میں اپنا گھٹیا کردار ادا کیا۔ ٹی وی چینلز، اینکر پرسنز اور تجزیہ نگار ہی اگر ہمارے اور ہماری قوم کے نمائندہ ہیں تو میں کہوں گا کہ (خاکم بدہن) یہ قوم مر چکی۔ پوری قوم نااہل ہو چکی، پوری قوم بازاری بن چکی، نااہل تو صرف نواز شریف ہوا ہے لیکن اخلاقی طور پر ننگے ہم سب ہو گئے ہیں۔

بے حیائی، ڈھٹائی اور حماقت کی کوئی حد بھی ہوتی ہے؟ شیخ رشید کہتا ہے اور برسرِ ٹی وی کہتا ہے کہ نواز شریف اور اس کی فیملی کی طرف سے ججوں کو اربوں روپے کی رشوت پیش کی گئی لیکن ججوں نے اس اربوں کی رشوت پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کیا۔ میرا دکھ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ شیخ رشید نے نواز شریف کی دشمنی میں ججوں کو بھی قابل فروخت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بقول شیخ صاحب جج فروخت نہیں ہوئے۔ ججوں کو رشوت پیش کرنا ایک گھناؤنا جرم ہے اور اگر یہ سچ نہیں بلکہ بہتان ہے تو یہ اُس سے بھی بڑا گھناؤنا جرم ہے۔ میرا دکھ یہ ہے کہ عزت مآب چیف جسٹس صاحب نے سوموٹو ایکشن لیتے ہوئے شیخ رشید صاحب سے کیوں نہیں پوچھا کہ اپنی بات کا ثبوت لاؤ۔ یا اپنے رفقائے کار جج صاحبان سے ہی کیوں نہیں پوچھ لیا کہ کیا ان میں سے کسی کو کوئی ایسی آفر ہوئی؟ کہیں تو یاوہ گوئی کے آگے بند باندھنے کا کام ہونا چاہیے۔ مجھ جیسا سادہ ذہن آدمی تو یہی سوچے گا کہ ہمارے جج بھی خریدے جا سکتے ہیں اور ملک کا وزیر اعظم اپنے بچاؤ کے لئے ایسا گھٹیا کام کر بھی سکتا ہے۔ اگر یہ تاثر میرے اور میرے جیسے دیگر سادہ ذہنوں میں بیٹھ جائے تو معاشرہ کس طرف چل پڑے گا۔ پہلے ہی ہم مایوسی میں عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے سے اجتناب کرتے ہیں اور حکومتی اہل کاروں پر کوئی اعتبار نہیں کرتے۔ میری عزت مآب چیف جسٹس پاکستان سے عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ اس امر کا نوٹس لیں۔ اگر شیخ رشید غلط بیانی کر رہا ہے تو

اُسے قرار واقعی سزا دیں اور اگر اس کی بات درست ہے تو رشوت کی آفر کرنے والوں کو عبرت کا نشان بنائیں۔

شیخ رشید نواز شریف کا چمچہ درجہ اوّل رہا ہے۔ دو تین بار اس کے ساتھ وفاقی وزیر کی موجیں اُڑائی ہیں۔ مشرف کے فوجی مارشل لا کے بعد مشرف کی نوکری کرتا رہا۔ مشرف کے جانے کے بعد پھر نواز شریف کی طرف آنے کی کوشش کی لیکن اس کے گھاس نہ ڈالنے پر اس کی جان کا دشمن بن گیا۔ عمران خان نے جو اُسے اپنے ہاں چپڑاسی لگانے کے لیے بھی تیار نہ تھا، اب اُسے اپنا سیاسی گرو بنا لیا ہے حتیٰ کہ چپڑاسیت سے اُسے ترقی دے کر شاہد خاقان عباسی کے مقابلے میں اُسے وزیر اعظم کا امیدوار نامزد کر دیا۔

یہ سارے مناظر ہم نے پچھلے چند سالوں اور اس سے زیادہ پچھلے چند مہینوں میں دیکھے۔ دیکھتے رہے اور حیران ہوتے رہے، اور حیران ہونے سے زیادہ پریشان ہوتے رہے کہ ہمارا "امیر جماعت" سپریم کورٹ کی طرف اُسی راستے پر رواں دواں رہا جس راستے پر شیخ رشید اٹھکیلیاں مارتا روز جاتا تھا۔ مسندِ مودودی پر بیٹھا شخص اگر لال حویلی والے شیخ رشید کی سطح پر اُتر آئے تو دکھ تو ہوتا ہے اور ہمارا دکھ تو اس وقت سوا ہوا جب مسندِ مودودی پر بیٹھے ہمارے محترم قائد شیخ رشید کی خدمت میں لال حویلی جا پہنچے اور تب اور بھی دکھ ہوا جب مسندِ مودودی پر بیٹھا قائد تحریک ملک کے سب سے "زاہد، متقی، دیانت دار اور امانت دار" زرداری کے دربار میں جا فروکش ہوا تا کہ نواز شریف کی کرپشن کے خلاف جہاد میں ان متقی حضرات کی اشیرباد حاصل کی جا سکے۔

نواز شریف اور اس کا پورا خاندان بدعنوان ہے اور انہوں نے کرپشن سے دولت اکٹھی کی ہے۔ یہ اتنے تواتر سے کہا گیا کہ عینی شاہد نہ ہونے کے باوجود دل ماننے کی طرف مائل ہے۔ سنی سنائی باتوں پر یقین کر لینے سے متعلق احادیث مبارکہ میں جتنی وعید سنائی گئی ہے (خاکم بدہن) پروپگنڈے کی وجہ سے یہ گناہ کر لینے میں شاید مضائقہ نہیں کہ نواز شریف اور اُن کے پورے خاندان کو کرپٹ مان لیا جائے، اس لیے بھی کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے لوگ سرکاری اختیار استعمال کر کے اربوں کے مالک بن گئے، نواز شریف اور اس کا خاندان تو حکومت کے اعلیٰ ترین مقام پر رہا ہے، وہ مستثنیٰ کیسے ہو سکتا ہے؟ اب جس ملک میں منبر و محراب پر بقول شورش کاشمیری بہروپیوں کا غلغلہ ہو اور بقول اقبال تہہ محرابِ مسجد سونے والے بھی سوتے کم اور بچوں کے لئے

آنے والی زکوٰۃ پر ہاتھ مارنے کے لیے جاگتے زیادہ ہوں، جہاں قبہ و جبہ والے منڈی لگائے بیٹھے ہوں اور جہاں درس وتدریس بھی تجارت کی شکل اختیار کر لے اور جہاں داتا دربار پر چڑھائی جانے والی دیگیں بھی حلال مال سے بنے ہونے کا یقین نہ دلا سکیں اور جہاں حج وعمرہ پر گئے سنت نبوی سے مزین چہرے کے حامل متشرع انسان کے ملازمین لپٹن چائے کے ڈبوں میں جعلی پتی ڈالتے ہوئے پکڑے جائیں وہاں آپ کسی سے بھی بدعنوانی اور کرپشن کی توقع رکھ سکتے ہیں۔نواز شریف اور اس کی اولاد تو بہر حال دنیا دار ہیں۔کرپشن کی بھی ہوگی، کرتے بھی ہوں گے اور شاید کرتے بھی رہیں گے لیکن انصاف تو ہونا چاہیے اور وہ بھی مضبوط بنیادوں پر ہونا چاہیے۔ایسی بنیاد پر نہیں کہ عدل وانصاف مذاق بن جائے اور عادل ومنصف کٹہرے میں کھڑے نظر آئیں۔نواز شریف کے لانگ مارچ سے اور کوئی نقصان ہوا ہو یا نہ ہو۔ یہ تو ہوا کہ "غلط یا ٹھیک" نا اہل نواز شریف نے پانچ معزز اور محترم ججوں کو عوامی کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔

بقیہ: الیکٹرانک میڈیا کی لت

بلکہ یہاں تو سوچنے سمجھنے کا موقع بھی زیادہ ہے اور تحقیق وسچ تک رسائی کی کوشش بھی، یہاں جو لکھا جاتا ہے وہ تاریخ رقم کرے گی ان شاءاللہ، یہاں الفاظ کا جادو اور چہرے کی چمک نہیں بلکہ بروقت اور تحقیق پر مبنی مواد ہی زیادہ کارفرما ہوتا ہے اور اسی کی ترویج زیادہ لائق اور فائق سمجھی جاتی ہے، یہاں ایک دوسرے کے پیچھے پڑنے کا وقت کم اور جاندار تنقید کا موقع زیادہ رہتا ہے، یہاں صبر اور امید نو کی سحر بھی دکھائی دیتی ہے الحمدللہ!

سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کلچر سے ہماری حفاظت بھی پرنٹ میڈیا ہی کے ذریعے ممکن ہے جو کہ دیمک کی مانند ہماری اقدار کو کھوکھلا کئے جا رہا ہے اور اس کی جگہ ان اقدار کے لئے جگہ بنائی جا رہی ہے جو کہ سرتا مونہ ہماری روایات سے میل کھاتے ہیں اور نہ ہی ہمارے کلچر سے۔

اس سب سے بچنے کے لئے اس شفاف میدان کو اپنانا ہی ہوگا اور ان سلیم الفکر رجال کار کو زیادہ سے زیادہ اس طرف توجہ دینی چاہیئے جن کو اللہ رب العزت نے ان صلاحیتوں سے مالا مال فرمایا ہے۔ وہ اپنی بہتر صلاحیتوں کو بروقت مقام پر بروئے کار لا کر نشاۃ ثانیہ کے اس خواب کو جلد پورا کر سکتے ہیں جس کی آس لگائے ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔

میڈیا　　عبدالمتین

الیکٹرانک میڈیا کی لت

ہم ایک منفرد قوم ہیں جو اس قدر نقصان اٹھانے کے عادی ہو چکے ہیں کہ اب اپنا نفع اور اپنا نقصان سمجھنا ہمارے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ ''الیکٹرانک میڈیا'' کے ساتھ ہمارا حالیہ رویہ ہے۔

ہم الیکٹرانک میڈیا کے گن گاتے تھکتے ہی نہیں ہیں کہ ہماری زبان اور ہماری آنکھیں گویا مفلوج ہو چکی ہیں اور اس قدر خیر پروف ہو چکی ہیں کہ اس میڈیا کا شر نہ ہمیں دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی ہم اس شر کی وضاحت کو کسی قیمت بول دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ اس تکنیکی اور گلوبل ولیج جیسے دور میں ہم ایسا کچھ کہنے سے کہیں ترقی کے دشمن اور جاہل گنوار نہ قرار دیے جائیں اور ان ناموں سے بچنے کے لئے ہم ہر قربانی دینے کو تیار ہیں جس میں ہمارا گھر بار، ہمارا نظام تعلیم، ہماری روایات اور خاص کر ہمارا کلچر اگر اس کی بلی چڑھ جائے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟

یہ بات سب سے پہلے ذہن نشین ہونا بہتر ہے کہ الیکٹرانک میڈیا سے اختلاف رکھنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم میڈیا کے دشمن ہیں۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ میڈیا تو ایک بہترین ذریعۂ ابلاغ ہے۔ یہ اتنا ہی اہم ہے جس قدر دعوت فکر و عمل۔ یہاں تک کہ ہم اپنے آباء کی خدمات سے جس اصل ذریعے سے واقف ہوئے وہ یہی میڈیا کا ہی ایک بہت بڑا حصہ ہے جسے ہم "پرنٹ میڈیا" کے نام سے جانتے ہیں۔

ہماری تاریخ کے اوراق پلٹنا ہمیں اس امر سے باخبر کرتا ہے کہ جب تاتاریوں نے عباسی حکومت کی کایا پلٹتے ہوئے قتل و غارت کی ہوس پار کر کے جب ہمارے اس علمی ذخیرے کی جانب نظر کی تو سب کا سب دریائے فرات کی نذر کر دیا جس کی سیاہی فرات پر بھی غالب آ گئی تھی۔

یہ سچ ہے کہ کوئی بھی شعبہ اپنی اصل میں خیر کو ہی پیش نظر رکھتا ہے اور شر کو عام طور پر اپنا مطمح نظر نہیں بناتا، لیکن یہ اصول الیکٹرانک میڈیا پر بالکل بھی فٹ نہیں آتا کیونکہ اس میڈیا کا جو جو رنگ ہم نے دیکھا ہے اس پر شر کے ہی اثرات غالب نظر آتے ہیں۔ آپ تجربہ کر کے ایک مکمل

دن اس کے سامنے بیٹھ جائیں اور پھر اپنی ذہنی و علمی سطح کو ٹٹولنا شروع کر دیں تو آپ کو نتیجتاً ذہنی خلفشار، مایوسی، انتشار اور مخالف پارٹی کے حوالے سے مضبوط دلائل کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا اور اس پر سہاگہ یہ کہ آپ کو تفریح کے نام پر اغیار کے کلچر سے بھی من وعن متعارف کرایا جا چکا ہو گا۔

اس الیکٹرانک میڈیا میں حق کم اور حق کا ڈھنڈورا زیادہ ہوتا ہے، مثبت کم اور منفی پہلوز یادہ اُجاگر کیا جاتا ہے، خیر کم اور شر کو زیادہ مہمیز دی جاتی ہے، حقائق کم اور جھوٹ فریب زیادہ ملتا ہے اور زندگی کے ایام کی قیمتی گھڑیاں دے کر بھی ہاتھ کچھ نہیں آتا۔

یہ دراصل خیر کے مراکز نہیں یہ تو اوروں کی مٹی پلید کر کے کمانے کا ذریعہ ہیں، یہ ابلاغ کا نہیں بلکہ پیسے کے لئے عزتوں کا سوداگر ہے، یہ ایسا جادوگر ہے کہ پل بھر میں آپ کی عزت کا سوداگر بن کر آپ کو ذلیل ورسوا کر دے گا اور ایک ذلیل کو عزتوں کے پہاڑ عطا کر دے گا۔

کیا ہم ان سرمایہ داروں سے حق آگہی کی امید وابستہ رکھ رہے ہیں جن کی کل کائنات فقط پیسہ ہی ہے جو کہ اس پیسے کے کھیل کو کھیلنا جانتے ہیں. جن کی مثال اس شر انگیز گروہ جیسی ہے جو چین، امن و آشتی کی اساس پر قائم دیوار کو توڑنا چاہتے ہیں جس میں جو جتنا زور لگائے اس کی طاقت (دولت) مزید بڑھ جاتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا کہ ہم دھوکہ اور نقصان اٹھانے کے عادی ہو چکے ہیں لیکن افسوس کہ ہم اپنی اس روش کو ضرورت، مجبوری اور وقت کے تقاضے کا راگ الاپ کر ذکر کرتے ہیں اور یہ راگ اس قدر الاپتے ہیں کہ ہم اپنی واقعی ضروریات زندگی اور حقیقی عصری تقاضوں کی طرف توجہ ہی نہیں کر پاتے۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس مضر اور زہر آلود الیکٹرانک میڈیا سے بچتے ہوئے آج بھی ہمارے پاس پرنٹ میڈیا جیسا محفوظ اور شفاف ذریعۂ ابلاغ میسر ہے جس کی ہمیں واقعی قدر کرنی چاہیے۔ ہم چاہے جتنی بھی نام نہاد ترقی کر لیں لیکن پرنٹ میڈیا اپنے اندر اب بھی وہ تمام فوائد سمیٹے ہوئے ہے جن کی ہمیں آج ضرورت ہے۔ آج بھی اس کا ابلاغ ایک وسیع پیمانے پر جانا اور مانا جاتا ہے اور آج بھی اس کے ذریعے وہ تمام خدمات بخوبی لی جاسکتی ہیں جن کا بے وقت آسرا ہم الیکٹرانک میڈیا سے لگائے رکھتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۵۳ پر)

مغربی فکرو تہذیب

فرید اللہ الصافی[1]

اہل مغرب کے اخلاق وعدل کا افسانہ

آج مسلمانوں کی اکثریت شعوری اور لاشعوری طور پر یہ ذہن میں رکھتی ہے اور بعض تو زبان سے اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں کہ غیر مسلم خاص طور پر یورپ کا معاشرہ عدل کا داعی اور اخلاق کا پیکر ہے۔

اس بات کو میزان عدل پر پیش کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اسلام نے نظریات کی اصلاح کو سب سے مقدم رکھا ہے اور اس کی تصحیح پر بڑا زور دیا ہے اور جہاں کہیں اس میں فساد کا شائبہ نظر آیا اسلام نے اس کا مکمل تدارک کیا ہے۔

سب سے پہلے اخلاق کا جامع مفہوم جاننا ضروری ہے تا کہ مسئلے کو جاننے میں آسانی ہو اور کسی قسم کی پیچیدگی آڑے نہ آئے۔

اہل علم ودانش نے اخلاق کا جامع مفہوم کچھ اس طرح بیان کیا ہے: دوسرے انسان کو تکلیف نہ دینا، سخاوت اور خیر کا برتن دوسرے پر انڈیلنا، اور ہنستے اور مسکراتے چہرے اور چمکتے ماتھے سے دوسروں کے ساتھ میل ملاپ کرنا۔

اس کے بعد تمہید کے طور پر اس دعوے کو یاد رکھا جائے کہ انسان کو انسان ہمیشہ آسمانی دین بناتا ہے اور جس قدر انسان خالق کی رشد وہدایت سے دور ہوتا جائے گا اسی قدر ظلمتوں کے پہاڑ اس پر چھاتے جائیں گے، اور آخر کار سفاکیت وجہالت اس کا میلا لباس بن کر اس کے روح وجسم کو ڈھانپتے ہوئے اسے انسانی صفات سے عاری کر کے صفات مذمومہ اور اخلاق قبیحہ کا چشمہ بنا دے گی اور ایک وقت آئے گا کہ یہ انسان اپنی فطرت کا جنازہ نکال کر اس مقام پر فائز ہو جائے کہ:

اَفَمَنۡ زُيِّنَ لَهٗ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ [الفاطر ۳۵:۸]

کہ اس کے منعکس چشمے میں اسے برا اچھا اور حسین قبیح نظر آئے گا، جو دراصل نتیجہ ہے اللہ کے اس فرمان کا:

فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجۡعَلُ اللّٰهُ الرِّجۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ

[1] Fareedullahassaafi@gmail.com

لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿125﴾ [الانعام ۶:۱۲۵]
کہ جس کسی کو اللہ صحیح راستہ دکھانے کا ارادہ کرے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جس کسی کی گمراہی کا اللہ ارادہ کرے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے۔ گویا کہ وہ آسمان میں چڑھتا ہے۔ اسی طرح اللہ ناپاکی مسلط کرتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔

گویا کہ اس کے شب و روز اندھیروں میں اور اس کا اخلاق و کردار کم ظرفی کا شکار ہو کر غلاظتوں میں ڈوب جاتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ اگر دین کی صورت میں ربانی سہارا نہ ہو تو انسان اپنے جہل کی وجہ سے درندوں کو شکست دے کر ان کی صفوں کو چیرتا ہوا ان سے بھی آگے نکل جاتا ہے کیونکہ درندوں کی درندگی صرف طاقت کی بنا پر ہے جبکہ یہاں طاقت کا ساتھ عقل بھی دے رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کفار کی دنیاوی تیزی اور عقلی جاذبیت کے باوجود کلام اللہ میں ان کی اصل صورت واضح کرتے ہوئے کبھی انہیں عام حیوانات سے تشبیہ دی جاتی ہے اور کبھی گدھے اور کتے کو ان کی مثال کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد مسئلے کو مزید واضح کرنے کے لیے محترم قارئین کرام سے میں کچھ سوال اور استفسار کرنا چاہتا ہوں:

۱۔ کیا ایسے انسان کو صاحب خلق کہا جا سکتا ہے جو مخلوق کے ساتھ تو ظاہری اخلاق سے پیش آئے اور خالق سے وہ ہر قسم کی بداخلاقی کو صرف جائز ہی نہ سمجھتا ہو بلکہ عملاً تمام بغاوتوں اور بداخلاقیوں کا مرتکب بھی ہو؟

۲۔ کیا اخلاق و انصاف کتوں کو اکراماً اپنے ہاتھوں سے غسل دینے اور انسانوں کے خون کو گندے پانی کی طرح ندی نالوں میں بہانے کا نام ہے؟ اور یہ بات جذبات کی حد تک نہیں بلکہ دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ آج دنیا میں مشرق سے لے کر مغرب تک جہاں بھی ظلم ہو رہا ہے خاص طور پر مسلم اقوام پر اس کی کڑی ان اخلاق کے پیکروں اور منصفوں سے بلاواسطہ یا بالواسطہ جڑتی ہے، جن کے اخلاق و کردار کے بے حس دنیا گیت گاتی ہے، کیا نادانوں کے کانوں میں بوجھ ہے جس نے انہیں مظلوم کی معصوم آواز سننے سے بہرا کر دیا ہے یا ان کی بصارت و بصیرت پر پردے پڑے ہوئے ہیں جو حقائق کی نقشہ کشی کرنے سے انہیں قاصر کر رہے ہیں؟

۳۔ کیا اخلاق اس چیز کا نام ہے کہ بغل میں چھری اور زبان سے محبت کا دعویٰ یا پھر دھوکے کا: کہ دل میں عداوت و نفرت اور لبوں پر مسکراہٹ۔ اس اخلاق سے تو اصحاب فراست

نے صدیوں پہلے پناہ مانگی تھی۔

۴۔ عقل کے بخیلوں اور اغیار کی تقلید کا چشمہ لگانے والوں کو یاد رہے کہ بچوں کی کم سنی کا فائدہ اسی طرح اٹھایا جاتا ہے کہ لبوں پر مسکراہٹ دکھا کر اور ہاتھ میں ٹافی تھما کر ان سے اپنے مطالب پورے کیے جاتے ہیں۔

۵۔ مزید یاد رہے کہ ان لوگوں میں کچھ جو ظاہری اخلاق نظر آ رہا ہے یہ دراصل انہوں نے تمہارے دین سے سیکھا ہے۔ اب لائق یہ ہے کہ ان سے متاثر ہونے کی بجائے اپنے اس دین سے متاثر ہوا جائے جو صرف اپنوں کو نہیں بلکہ اغیار کو بھی ترقی کے منازل طے کراتا ہے اور کیا خیال ہے کہ اگر اپنے گھر کا بندہ اس پر کاربند ہو تو اس کی شان کا اندازہ لگایا جا سکے گا؟

اس کے ساتھ ساتھ ہم حقیقت پر مبنی اس حق گوئی سے بھی کوئی عار نہیں محسوس کرتے کہ: ایک اخلاق کا کمزور موحد مسلمان اعلیٰ اخلاق رکھنے والے کافر سے ہزار درجے بہتر ہے۔ کیا ہم اغیار کے تاثر کی وجہ سے قرآن کے اس فرمان کو بھول چکے ہیں یا نعوذ باللہ اس سے انکاری ہیں کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ [التوبہ ۹:۲۸]

کہ اے ایمان والو! بے شک مشرک پلید ہیں۔ اور مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ جب تک زمین میں ایک بھی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کہنے والا ہے اس وقت تک قیامت برپا نہیں ہوگی۔

آخر میں یہ بات یاد رہے کہ یہ محض سیاسی گفتگو نہیں بلکہ یہ ایک اہم اسلامی عقیدے الولاء والبراء کا تقاضا اور سورۃ المجادلہ کی اس آیت کا مصداق ہے کہ:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ط [المجادلہ ۵۸:۲۲]

کہ آپ ان لوگوں کو جو اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لائے ہیں ہرگز اس طرح نہیں پائیں گے کہ وہ ان لوگوں سے محبت کرنے والے ہوں جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھتے ہوں اگرچہ یہ ان کے آباؤ اجداد، ان کے بیٹے، ان کے بھائی اور ان کے کنبے کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔

اور اس نظریے اور تفریق کو بھلا دینا درحقیقت جنگ بدر اور ان بدری صحابہ کی شعوری اور لاشعوری طور پر توہین ہے جو دینی رشتے سے وفا کرتے ہوئے اپنے آباؤ اجداد اور اپنے اعزہ کے مقابلے میں تلواریں لے کر میدان میں نکلے اور پھر ان کے سر تن سے جدا کرتے چلے گئے اور اسی پر بس نہ کیا بلکہ ان پر ماتم کرنے کی بجائے فتح کے گیت بھی گائے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔